SD000000303966
کھوئے ہوئے معانی
891.439
نرنجن سنگھ تسنیم

ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ پنجابی ناول

کھوئے ہوئے معانی

مصنف

نرنجن سنگھ تسنیم

منظور حسن

ساہتیہ اکادمی

Khoye Huye Ma'ani : Urdu translation by Manzoor Hasan of Punjabi Award-winning novel *Gawache Arth* by Niranjan Singh Tasneem. Sahitya Akademi, New Delhi (2009), Rs. 125.

پہلا ایڈیشن : 2009

ساہتیہ اکادمی

ہیڈ آفس :

رویندر بھون، 35 فیروز شاہ روڈ، نئی دہلی 110 001

سیلس آفس : سواتی، مندر مارگ، نئی دہلی 110 001

علاقائی دفاتر :

جیون تارا بھون، 23 اے/44 ایکس، ڈائمنڈ ہاربر روڈ، کولکاتا 700053

172، ممبئی مراٹھی سنگھرالے مارگ، دادر، ممبئی 400014

سینٹرل کالج کیمپس، ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر ویدھی، بنگلور 560001

مین بلڈنگ، گونا بلڈنگس (دوسری منزل)، 443(304)، انا سلائی، تینم پیٹ، چنئی 600018

قیمت : 125 روپے

ISBN 978-81-260-2442-1

Website : http://www.sahitya-akademi.gov.in

طابع : ناگری پرنٹرس، دہلی

کچھ مصنف کی طرف سے

پنجابی ناول نگاری کو وراثت میں یہ رجحان ملا ہے کہ ساری بات قارئین تک واضح شکل میں پہنچا دی جائے۔ نتیجتاً پنجابی قاری کو کہانی سننے کا ایسا شوق پیدا ہوا کہ وہ ناول میں ان کہی یا اشاراتی شکل میں کہی ہوئی بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ روایتی رجحانات سے ہٹ کر لکھے گئے پنجابی ناول زیادہ تر نظرانداز ہوکر ہی رہ گئے۔ ہمارے بیشتر اکادمک ناقدین کسی نئے تھیم کو ظاہر کرتے ہوئے یا کسی نئی تکنیک کے تحت لکھے گئے ناول کو بنظر غائر دیکھتے۔ ویسے غیرملکی ادب میں وہ ان باتوں کی خصوصی طور پر تعریف کرتے ہیں۔ کئی مرتبہ وہ جلد بازی میں یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ کچھ ناول نویس مغربی ناول کی تقلید کرتے ہیں۔ اس وقت وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ بطور ایک آرٹ فارم ناول مغرب کی ہی دین ہے۔ پھر ان کی طرف سے لگایا گیا تقلید کا الزام، ان کی اپنی ذہنی بندشوں کی علامت ہے اور کچھ نہیں۔

میں نے اپنے اس ناول 'کھوئے ہوئے معانی' میں سوانحی ناول والی تکنیک اپنائی ہے۔ کسی ناول نگار کے لیے یہ بات کوئی زیادہ مشکل نہیں ہوتی کہ وہ اپنی زندگی کے واقعات کو اپنے کسی ہیرو کے ساتھ جوڑ دے یا کسی دوسرے شخص کے ساتھ گزری باتوں کو اپنے تجربے کا حصہ بنالے۔ پھر بھی کبھی کبھی اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ گزرے واقعات کو اور اپنے رابطے میں آئے لوگوں کو ہو بہو پیش کردے۔ اس طرح وہ جہاں اپنے ذہنی تناؤ سے نجات حاصل کرلیتا ہے، وہیں اپنی تصنیف میں اصلیت کی غلط فہمی ابھارنے میں بھی کامیاب ہوجاتا ہے۔ یہی حکمتِ عملی ناول کو 'نان فکشن' ناول کے نزدیک لے جاتی ہے۔

حرفِ آغاز

'کھوئے ہوئے معانی' پروفیسر نرنجن سنگھ تسنیم کا لکھا ہوا پنجابی زبان کا ایک ایسا شاہکار سوانحی ناول ہے جس پر ساہتیہ اکادمی نئی دہلی سے انھیں ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ مذکورہ اکادمی نے جب اس کے اردو ترجمے کا کام مجھے سونپا تو بحیثیت پنجابی ہونے کے یقیناً مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ ترجمہ شروع کرنے سے پہلے جب میں نے اس ناول کا سرسری مطالعہ کیا تو لگا کہ اسے اردو قالب میں ڈھالنا نہایت آسان ہوگا، لیکن جب عملی طور پر کام شروع کیا تو ماجھا خطہ کے بعض خصیٹھ پنجابی الفاظ، جپ جی صاحب کی پوڑی۔ 11 بعض مصرعوں اور ناول نگار کے مخصوص اسلوب بیان کا مسئلہ درپیش آیا تو قدرے مشکل محسوس ہوا، لیکن میں نے بھی اس کام کو ایک چیلنج سمجھتے ہوئے شروع کیا تو یہ کام کئی وجوہات کی بنا پر آسان سے آسان تر ہوتا چلا گیا مثلاً ناول نگار نے جس گورو کی نگری پر اپنا کینوس فوکس کرکے کہانی کا تانا بانا تیار کیا ہے اور اس میں جن گلی کوچوں، سڑکوں، مندروں، گردواروں بالخصوص شری ہرمندر صاحب اور دیگر اہم مقامات کا ذکر کیا ہے وہ سارے میں نے اپنے قیام امرتسر کے دوران خوب اچھی طرح دیکھے ہوئے ہیں اس لیے بھی کہ میں گرو نانک دیو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں جولائی 1982 سے مئی 1984 تک بحیثیت ریسرچ اسکالر مقیم رہا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ دوران ترجمہ جب جب ان مقامات کا ذکر آتا تو وہ سارے مقامات میری آنکھوں کے سامنے گھومتے رہتے۔ اس طرح مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں خود اس ناول کی کہانی کا اہم کردار بن گیا ہوں۔

دوسرے میری خوش قسمتی سے میرے قریبی حلقے میں ایسی ایسی لائق و فائق اور روشن دماغ ادبی شخصیات جن میں ڈاکٹر زینت اللہ جاوید، ڈاکٹر ایس ترنم، جناب رمضان سعید،

ڈاکٹر جترم چندو آش، پروفیسر ڈی ڈی بھٹی، ڈاکٹر محمد اقبال اور ڈاکٹر محمد جمیل جیسی موجود تھیں جن کی اردو اور پنجابی ادب پر یکساں اور گہری نظر تھی، ان حضرات نے دوران ترجمہ بوقتِ ضرورت میری بڑی مدد کی اور ساتھ ہی حوصلہ افزائی بھی فرمائی، جس کے لیے یہ سبھی لوگ میرے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔

فنِ ترجمہ نگاری کے اندر لفظی ترجمہ کو معیوب سمجھا جاتا ہے کیونکہ ایسا کرنے سے ترجمے کی اصل روح تک رسائی بے حد مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کے اس خیال سے راقم السطور سو فیصد متفق ہے کہ "ادبی شہ پاروں کا لفظی ترجمہ عیب سمجھا جاتا ہے کیونکہ عام طور سے لفظی ترجمے میں شاعر یا ادیب کا اصل مفہوم خبط ہو جاتا ہے، اس لیے ادبی تحریروں کے ترجمے میں مترجم کو خاص آزادی لینی ہوتی ہے۔ وہ عام طور سے شاعر یا ادیب کا اصل مفہوم سمجھ کر اسے اپنی زبان میں بیان کر دیتا ہے۔"

لہٰذا راقم السطور نے بھی 'کھوئے ہوئے معانی' کا ترجمے کرتے وقت لفظی ترجمے سے اجتناب کرتے ہوئے بس مفہوم کی صحیح ادائیگی پر ہی توجہ مرکوز کی ہے۔ امید واثق ہے کہ اس چیز کو مدنظر رکھ کر کیا ہوا ترجمہ قارئین کو پسند آئے گا۔ میری بہترین کوششوں کے باوجود اگر اس میں کچھ خامیاں یا کوتاہیاں باقی رہ گئی ہوں تو قارئین اس شعر کی روشنی میں مجھے معاف فرمائیں:

کامل کی جو پوچھو تو خضر بھی نہیں کامل
جینا اسے آتا ہے تو مرنا نہیں آتا

منظور حسن

پوسٹ گریجویٹ شعبۂ اردو
گورنمنٹ کالج، مالیرکوٹلہ
(پنجاب)

اس ناول کے اندر میں نے اپنی کچھ ذاتی باتیں قارئین کے ساتھ بانٹنے کے بہانے موجودہ پنجاب کے المیے کی تصویرکشی کی ہے۔ یہ دکھ درد جو ہم گزشتہ دس سالوں سے جھیل رہے ہیں یہ محض پانچ دنوں میں ناول کی صورت اختیار کر گئے۔ بے شک یہ ناول ستمبر 1985 تک کے حالات کی داستان بیان کرتا ہے، لیکن ناول نگار کو 1992 تک کے حالات کے متعلق ملی واقفیت بھی اس تصنیف میں کارفرما ہے۔ کسی قوم کی شاندار تاریخ میں رکاوٹ اس وقت پڑتی ہے جب عام لوگ صحت مند اعلیٰ انسانی اقدار کو آنکھوں سے اوجھل کرنے کے مجرم بن جائیں۔ جانے انجانے میں میری یہ تصنیف جہاں ایک طرف نومبر 1984 کے دنگوں کو 1947 کے فسادات کے تناظر میں پیش کرتی ہے، وہیں دوسری طرف غیور پنجابیوں کی زندگی کے کھوئے ہوئے معانی کو تلاش کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔

ویسے تو میں نے اپنی زندگی میں شخصیت پرستی (ہیرو ورشپ) سے ہمیشہ ہی احتراز کیا ہے، پھر بھی پتا نہیں کیوں مرزا غالب کا یہ شعر مجھے بار بار یاد آ رہا ہے:

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
اک آبلہ پا وادیٔ پُرخار میں آوے

نرنجن سنگھ تسنیم

77 وشال نگر، پکھووال روڈ، لدھیانہ – 141002

1

ہال گیٹ کی گھڑی میں اس وقت پانچ بج کر بیس منٹ ہو چکے تھے۔ گیٹ کے اندر باہر پولس کے کئی سپاہی کھڑے تھے۔ میری رکشا جب ان کے پاس سے گزری تو ان میں سے تین چار چوکنے ہو گئے اور ٹکٹکی باندھ کر میری طرف دیکھنے لگے۔ ایک دو کی طرف میں نے بھی گھور کر دیکھا۔ بڑی عجیب بات تھی۔ میرے سر پر بندھی ہوئی پگڑی اور اوپر کو اٹھتی ہوئی مونچھیں دیکھ کر یہ لوگ گھبرا سے کیوں گئے تھے۔ میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا اور نہ ہی اس طرح کا کوئی ارادہ تھا۔ کسی ضروری کام کی غرض سے میں گرونانک دیو یونیورسٹی گیا تھا ور وہاں سے فارغ ہو کر گرورام داس سرائے کی طرف جارہا تھا۔ سرائے کے نزدیک ہی ایک مارکیٹ میں کلبیر سنگھ کا پبلشنگ ہاؤس تھا۔ پہلے میں نے اس کی دکان پر جانا تھا اور پھر اس کے ساتھ اس کے گھر، لیکن اب اس طرح لگ رہا تھا جیسے میرا وہاں پہنچنا ممکن نہ ہو۔

رکشا ہال گیٹ کے نیچے سے گزر کر ہال بازار میں آگئی۔ رکشا والا اپنے خیالوں میں کھویا ہوا پیڈل مارے جارہا تھا لیکن وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ دکانیں بند تھیں اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کچھ لوگ ٹولیاں بنا کر کھڑے تھے۔ زیادہ لوگ مونے تھے لیکن کوئی کوئی پگڑی والا بھی ان میں کھڑا تھا۔ پگڑی والے کو دیکھ کر مجھے کچھ تسلی محسوس ہوتی۔ ویسے ہی جیسے چالیس سال پہلے اسی جگہ سے گزرتے ہوئے ہوئی تھی۔

اس وقت بات کچھ اور تھی۔ میں سینٹرل جیل لاہور سے ایک مہینے کی قید کاٹ کر امرتسر واپس آرہا تھا۔ اس وقت میرے ساتھ مجھے لاہور سے لینے گئے میرے باؤ جی تھے اور ہماری گلی کے تین چار اور افراد جو میرے ساتھ ہی پکڑے گئے تھے۔ انھی دنوں امرتسر

میں ہندو مسلم فساد ہو رہے تھے۔ سکھ ہندوؤں کے ساتھ تھے کیونکہ مسلمان ان دونوں میں فرق نہیں سمجھتے تھے۔ ایک ہی دشمن کا مقابلہ کرنے کی وجہ سے ہندوؤں اور سکھوں کے آپسی تعلقات اور بھی مستحکم ہو گئے تھے۔ زیادہ فرق پہلے بھی ان میں کوئی نہیں تھا، اگر چہ کئی لحاظ سے تھا بھی۔

اس وقت تقریباً ایک مہینہ قبل کچھ شرارتی لوگوں نے مٹی کے تیل میں بھیگے ہوئے ٹاٹ کے ٹکڑوں کو آگ لگا کر ہماری گلی کے پیچھے مسلمانوں کے گھروں پر پھینکا تھا۔ اس طرح دونوں طرف ہنگامہ ہو گیا اور ادھر ادھر سے کچھ گولیاں بھی چلیں۔ اتنے میں ایک مسلمان مجسٹریٹ اپنے ساتھ کچھ گورکھے فوجی لے کر وہاں آ گیا اور ہماری گلی کو گھیر لیا۔ گورکھوں نے گھر گھر جا کر تلاشی لی اور مردوں کو گھروں سے باہر نکال لائے۔ پہلے ہم سبھی کو بازار میں قطاروں میں بٹھایا گیا اور پھر بسوں میں بھر کر وہ ہمیں کوتوالی لے گئے۔ وہ رات ہم تیس بتیس لوگوں نے اندھیری کوٹھری جیسی کوتوالی میں کاٹی اور اگلے دن شام کو لاہور کی سینٹرل جیل میں ہمیں منتقل کر دیا گیا۔

وہاں ہم نے ایک مہینے کی سزا کاٹی اور پھر ٹرین کے ذریعے لاہور سے امرتسر آ گئے۔ اسٹیشن سے باہر آ کر تانگے میں بیٹھتے وقت یہ سوال پیدا ہوا کہ کون سے گیٹ کے ذریعے گھر جایا جائے۔ ہماری گلی کے نزدیک تو ہاتھی گیٹ تھا لیکن یہ علاقہ مسلمانوں کا گڑھ ہونے کی وجہ سے یہاں سے گزرنا ٹھیک نہیں تھا۔ آخر ہال گیٹ سے ہو کر کچھ راستے بدل بدل کر گھر پہنچنا مناسب سمجھا گیا، جس وقت ہمارا تانگہ ہال گیٹ کے پاس پہنچا تو جگہ جگہ وہاں ہمیں مسلمانوں کی ٹولیاں نظر آئیں۔ یہ دیکھ کر ہمارے دل دہل گئے۔ یہاں کوئی نہ کوئی ناگہانی واقعہ ہو سکتا تھا۔ تانگے والا پتا نہیں کون تھا لیکن وہ بے دھڑک ہو کر ہال گیٹ کے نیچے سے گزر گیا۔ پھر گھوڑے کو چابک مارتا ہوا وہ ہال بازار سے گزرنے لگا۔ کچھ دور جا کر ہمیں کچھ اور ٹولیاں نظر آئیں لیکن ان میں کوئی کوئی پگڑی والا بندہ بھی کھڑا تھا۔ اس طرح کسی پگڑی والے کو دیکھ کر ہمارے دل کو بہت تسلی ملتی، کیونکہ اس سے دور سے ہی یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ ٹولی ہندوؤں اور سکھوں کی ہے۔

اب پھر ستمبر 1985 میں اسی جگہ پر اور ان ٹولیوں میں چند پگڑی والے آدمیوں کو دیکھ کر مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ ٹاؤن ہال کے پاس پہنچ کر ماحول کچھ شانت دکھائی دیا۔ ملکہ کے مجسمہ والے چوک کے پاس رکشا رکوا کر میں نے کسی سے پوچھا ''کیا بات ہوئی ہے، بازار بند کیوں ہو گیا؟''

''تمھیں نہیں پتا؟'' اس شخص نے حیرانی کے ساتھ میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا اور کہنے لگا، ''تھوڑی دیر پہلے کسی نے چوپڑہ صاحب کو گولی مار کر ہلاک کر دیا ہے۔''

چوپڑہ صاحب، ہمارے پڑوسی، جن سنگھی، ہنس مکھ، میرے دل میں کئی طرح کے خیالات ابھرے۔ ہمارے خیالات و نظریات میں فرق ہونے کی وجہ سے میری ان سے زیادہ ہم آہنگی تو نہیں تھی۔ بے شک میں راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کا ممبر رہ چکا تھا لیکن یہ بات تو پاکستان بننے سے پہلے کی تھی۔ ویسے بھی میں سنگھ میں اپنی گلی محلے کے لڑکوں کے ساتھ کبڈی یا کھو کھو کھیلنے کی غرض کے ساتھ ہی سے جایا کرتا تھا۔ جس شاکھا سے میرا تعلق تھا اس کا انچارج بلرام تھا اور ہر دیو پرکاش سارے شہر کا سنچالک۔ اس وقت ہمارا مقصد دیش کو آزاد کروانے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو ٹھکانے لگا کر رکھنا بھی تھا۔ اتہاس گواہ تھا کہ ماضی میں مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں پر بے شمار ظلم کیے تھے۔ دیش کی تقسیم کی آگ میں نفرت کی آگ دونوں طرف بھڑک چکی تھی۔ لگتا تو ایسے تھا کہ سینتالیس کے فسادوں کی آگ میں نفرت کا یہ بیج ہمیشہ کے لیے بھسم ہو جائے گا، لیکن تھوڑا عرصہ گزرنے پر ہی یہ بیج ہندوؤں اور سکھوں کے آپسی تعلقات کے مابین پھر سے پھوٹنا شروع ہو گیا تھا۔

ابھی میں ان خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ رکشے والا مجھے سرائے رام داس کے چوک میں لے آیا۔ وہاں چوک میں حفاظتی پولس کے دستے کھڑے تھے اور وہ لوگ کسی کو بھی آگے نہیں جانے دیتے تھے۔ وہاں کسی قسم کی دلیل کی گنجائش نہیں تھی۔ واپس لوٹ جاؤ ادھر ادھر ہو جاؤ، لیکن آگے نہ جاؤ۔ وہاں مجھے وہ مارکیٹ نظر آ رہی تھی جہاں میں نے جانا تھا۔ اس مارکیٹ کی سڑک کے ساتھ لگتی دکانیں بند تھیں۔ اس لیے ظاہر تھا کہ پوری

مارکیٹ ہی بند ہوگی۔ رکشا والے کو میں نے بھگتاں والے گیٹ کی طرف لے جانے کے لیے کہا۔ اس وقت سیدھے کلبیر سنگھ کے گھر جانا ہی ٹھیک تھا۔ جب میں اس کے گھر پہنچا تو وہ میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔

''کرفیو لگ جانے کے ڈر سے مجھے دکان سے جلدی آنا پڑا۔''

''پہلے تو میں نے سوچا تھا کہ اپنے گھر ہی چلا جاؤں۔ یہاں پہنچنا بہت محال لگ رہا تھا۔''

''آپ نے اچھا کیا جو یہاں آ گئے، نہیں تو مجھے بہت پچھتاوا ہوتا۔''

''سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اب یہ شہر بیگانہ لگنے لگا ہے۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہو، بلبیر جی؟ اس شہر میں آپ پلے بڑھے، یہیں پروان چڑھے۔ آپ کو اب یہ گلیاں اور بازار اجنبی کیسے لگنے لگے؟''

''پتا نہیں کیوں، کلبیر، اب میں جب بہیے والے کنوئیں سے اپنی گلی کی طرف جاتا ہوں تو کئی آدمی میری طرف ایسے دیکھتے ہیں جیسے میں کوئی اجنبی ہوں۔ کوئی وقت تھا کہ اتنا فاصلہ طے کرتے ہوئے مجھے کئی جگہوں پر کسی کے ساتھ ہاتھ ملانے کے لیے یا چھوٹی موٹی بات کرنے کے لیے رکنا پڑتا تھا۔''

''چلو چھوڑو، پرانی باتیں، وہ وقت بیت گیا۔ اتنے سال آپ باہر رہے ہو۔ کیا ہوا اگر سال ڈیڑھ سال بعد اپنے گھر میں چکر لگانے کا موقع مل گیا۔''

''ٹھیک ہے تمھاری بات، کلبیر، وقت کی رفتار تو رکتی نہیں لیکن دل پر جو نقش بن جاتے ہیں وہ ویسے کے ویسے قائم رہتے ہیں۔ بلکہ وہ تو وقت کے غبار کے نیچے سے اور بھی نمایاں ہونے لگتے ہیں۔''

کلبیر سنگھ کچھ دیر کے لیے چپ رہا، پھر وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے اپنی جیب سے رومال نکال کر ماتھے کا پسینہ پونچھا، پھر اس رومال سے اپنی ناک کو دونوں طرف سے صاف کیا۔ رومال کی اوپری تہوں پر میل جم گئی۔ رومال کی ان تہوں کو الٹا کر میں نے نیچے کی صاف تہوں کو اوپر کی طرف کر لیا۔ اس طرح ایک پردہ سا تو ہو گیا لیکن تہوں کے

نیچے چھپی ہوئی میل کا وجود ویسے کا ویسے قائم رہا۔

گزشتہ کچھ سالوں سے کئی مرتبہ ایسا ہو چکا تھا۔ ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان پائی جانے والی کشیدگی کے اوپر پردہ ڈالنے کی کوشش زیادہ دیر کے لیے کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ اندرونی حقیقت کسی نہ کسی شکل میں ظاہر ہو جاتی تھی۔ کدورت دلوں کی تہوں میں روپوش ہونے کے باوجود اپنی ہستی کو قائم رکھ رہی تھی۔ یہ تو بلکہ کوئی چھوٹی سی بات کی وجہ سے اور بھی ابھر آتی تھی۔ پھر وہی کچھ ہونے لگتا تھا جو سینتالیس میں ہوتا رہا تھا۔ جلسے جلوس، نعرے بازی، کڑوی نظریں، بدمزہ باتیں، وقت بے وقت کسی کے قابو آ جانے پر اس سے پوری قوم کا بدلہ لینا، مار دھاڑ اور آگ زنی۔ اس وقت سے اب تک کتنا وقت گزر چکا تھا۔ ہر سال نئے کیلنڈر دیواروں پر لٹک جاتے تھے۔ بچے جوان ہو گئے تھے اور جوان بوڑھے۔ ایک اور فرق بھی پڑ گیا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں والی ایک دوسرے کے تئیں وشواس کی کمی اب ہندوؤں اور سکھوں میں ظاہر ہو گئی لگتی تھی۔

چائے پیتے ہوئے ہماری باتوں کا رخ بدلا۔ مسز کلبیر سنگھ اور بھائی جی بھی ہمارے پاس آ بیٹھے۔ ان کو میں پہلے بھی لیکن تھوڑے عرصے کے لیے مل چکا تھا۔ مسز کلبیر سنگھ نے بسکٹوں والی پلیٹ میری طرف بڑھائی۔ میں نے ان میں سے ایک بسکٹ اٹھا لیا۔ پہلے چائے کا ایک گھونٹ بھرا، پھر بسکٹ کا ایک ٹکڑا دانتوں کے ساتھ توڑا باقی کا بسکٹ چائے کی پیالی والی پلیٹ میں رکھ کر میں نے وہ پلیٹ ٹیبل پر رکھ دی پھر میں نے بھائی جی سے پوچھا۔

''آپ کو باؤجی کے ناولوں کی رائلٹی تو ملتی رہتی ہوگی؟''

''ہاں، مل جاتی ہے، لیکن کبھی ملتی بھی نہیں۔''

''وہ کیسے؟''

''اس لیے کہ میں کسی سے حساب نہیں مانگتی، جو کسی نے بھیج دیا لے لیا۔ کون ایسے ہی سر کھپائی کرتا پھرے۔''

''ٹھیک ہے، آپ کی بات۔ اس وقت نانک سنگھ وغیرہ کے ناول 'چٹا لہو' (سفید لہو)

کے ساتھ میرا ناول 'اک ہورنواں سال' (ایک اور نیا سال) بھی میٹرک میں لگا تھا۔ مجھے کچھ سال تو اس کی رائلٹی ملتی رہی، پھر وہ خاموش ہو گئے اور میں نے بھی ان کی خاموشی کو توڑنا مناسب نہ سمجھا۔"

"اور کوئی ناول لکھا ہے، آپ نے؟"

"لکھتا رہتا ہوں، بھابی جی، لیکن کیا فائدہ؟"

"باؤجی کہا کرتے تھے کہ لکھنا کبھی بند نہیں کرنا چاہیے۔ ناول نگار قارئین کے لیے لکھتا ہے، ناقدین کے لیے نہیں۔"

"اب تو زیادہ تر ناول نگار اپنی بات سمجھانے کے لیے آپ ہی ناقدین بن گئے ہیں۔"

میری بات سن کر بھابی جی تھوڑا مسکرائے لیکن منھ سے کچھ نہ کہا۔ مسز کلبیر سنگھ نے میز پر سے چائے کے برتن سمیٹ لیے۔ کلبیر نے میری طرف گہری نظروں کے ساتھ دیکھا۔

"آپ کی ناول نگاری والی کتاب بکی نہیں، ویسے کی ویسے پڑی ہے۔"

"اس طرح کی کتابیں آہستہ آہستہ بکتی ہیں، لوگ ناول پڑھنا نہیں چاہتے، ناول نگاری میں دلچسپی تو بعد کی بات ہے۔"

"ویسے بلبیر جی، فکر والی کوئی بات نہیں۔ جہاں میرے گودام میں اتنی کتابیں پڑی ہوئی ہیں یہ بھی پڑی رہیں گی۔"

"چلو یہ تو تمھاری بات ٹھیک ہے، لیکن اس کتاب کو چھاپنے کے لیے تم نے اس وقت ہاں کیسے کر دی تھی؟"

"دراصل میں سبھی کتابیں اپنی مرضی کی نہیں چھاپتا، کچھ اپنے چہیتے ادیبوں کی پسند کی بھی چھاپ دیتا ہوں۔"

"لیکن میری اس کتاب کو دیکھ کر لدھیانہ کے ایک پبلشر نے چنڈی گڑھ میں، تمھارے بڑے بھائی کے گھر بیٹھے ہوئے، مجھے پوچھا تھا — 'کون پڑھے گا یہ کتاب؟ کس

کو ضرورت ہے، آپ کی تصویریں دیکھنے کی؟' یہ بات سن کر پہلے تو مجھے حیرانی ہوئی لیکن جلدی ہی میں نے اس بات کو ہنسی میں ٹال دیا۔"

"بلبیر جی، اپنے اوپر ہنسنا بہت مشکل بات ہے، پتا نہیں آپ یہ بات کیسے برداشت کر گئے؟"

"اس کی بات سن کر مجھے ایسے لگا جیسے وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہو اور میں سوچ میں پڑ گیا۔"

"لیکن سب سے زیادہ آپ کی یہ کتاب اسی پبلشر نے فروخت کی ہے، بلکہ پچھلے ہفتے اس نے اس کی پچیس کاپیاں اور منگوائی تھیں۔"

"کلبیر جی، میں تو صرف اتنا ہی کہوں گا — 'چلو اچھا ہوا کام آگئی دیوانگی اپنی۔'"

ہم دونوں شرمندہ سے ہنس پڑے۔ کلبیر نے ایک نظر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ اس نے بتی روشن کر دی۔ کچھ دیر کے لیے یہ فرق کرنا مشکل تھا کہ غروب شدہ سورج کی لو کونسی ہے اور بلب کی روشنی کونسی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کمرے کی روشنی گہری ہونی شروع ہوگئی۔ جیسے جیسے یہ گہری ہوتی گئی کھڑکی سے باہر اندھیرا بڑھتا گیا۔ کمرے میں پھیلی ہوئی خاموشی کا احساس ہم دونوں کو ایک ہی وقت میں ہوا لیکن پہل کلبیر سنگھ نے کی۔

"خاموشی کا بھی ایک شور ہوتا ہے۔"

"لیکن اس شور کو سننے کے لیے زیادہ لوگ تیار نہیں ہوتے۔"

"وہ اس لیے، بلبیر جی کہ وہ اپنے آپ سے ڈرتے ہیں۔"

"حالانکہ خاموشی تو گلے لگا لینے والی چیز ہے۔"

"آپ کو تو خاموشی بہت اچھی لگتی ہوگی؟"

"ہاں، کلبیر — بہت اچھی، لیکن تنہائی کی خاموشی اور دو اشخاص کے بیچ کی خاموشی میں فرق ہوتا ہے۔"

"دو اشخاص کے درمیان کی خاموشی تو پتھر کی مانند ہوتی ہے، جو کم کرنے سے بھی

میں ٹوٹتی نہیں۔''

''تم تو شاعر ہو، کلبیر — پھر نظم کیوں نہیں لکھتے؟''

''لکھتا ہوں، لیکن اپنے دل کی سلیٹ پر۔''

اس طرح کی باتیں کافی دیر تک ہوتی رہیں، میرے دل میں عجیب سے سوال اٹھ رہے تھے۔ یہ جو کچھ پنجاب میں ہورہا تھا، کیوں ہورہا تھا؟ ایک جماعت مایوس تھی اور دوسری جماعت اس مایوسی کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہی تھی۔ اسی طرح کی بے رخی نے پاکستان کو وجود بخشا تھا۔ اس وقت جو گھاؤ ہمارے دلوں پر لگے تھے وہ ابھی تک رس رہے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا واگھہ بارڈر پر وداع کے وقت سلمٰی نے اپنی آنکھیں جھپکتے ہوئے مجھے پوچھا تھا، ''بیری، تم ہمارا ملک دیکھنے کب آؤ گے؟'' گھبراہٹ میں میں صرف اتنا ہی کہہ سکا تھا، ''تمھارا ملک، سلمٰی؟'' سلمٰی نے فوراً ہی جواب دے دیا تھا، ''ہاں — ہمارا ملک۔'' لیکن مجھے تو ابھی تک اس بات کی سمجھ نہیں آئی کہ ہمارے ملک کی حدیں کہاں ختم ہوتی ہیں اور ان کے ملک کی حدیں کہاں سے شروع؟ جس بادل کے بارے بھایا جی (دادا جی) کہا کرتے تھے کہ یہ لاہور کی طرف سے آیا ہے، بہت برسے گا۔ وہ اب بھی وہیں سے آتا ہے اور خوب برستا ہے۔

ابھی زیادہ وقت تو نہیں ہوا تھا، شاید نو، ساڑھے نو بجے تھے، لیکن جلدی جلدی کھانا کھا کر میں گھر کی طرف چل پڑا۔ کلبیر سنگھ نے مجھے وہیں رکنے کے لیے کہا لیکن مجھے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ اس لیے نہیں کہ میرا وہاں کوئی انتظار کر رہا تھا بلکہ اس لیے کہ اس کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کے ساتھ بچپن سے ہی میرا کوئی تعلق تھا، جیسے کسی پھول کا اپنے گملے کے ساتھ ہوتا ہے۔ رکشے میں بیٹھا میں گھر کی طرف جارہا تھا۔ سڑکیں ویران تھیں اور چاروں طرف ڈر اور خوف کا دور دورہ تھا۔ رکشا بڑی تیزی کے ساتھ چلتی جارہی تھی، پتا نہیں رکشا والا ہندو تھا یا سکھ لیکن وہ غریب ضرور تھا، ہر غریب آدمی کا مذہب ایک ہی ہوتا ہے — غریبی۔ میں نے اس کے ساتھ کوئی بات کرنی چاہی لیکن وہ رکشا چلانے میں پوری طرح محو تھا۔ میں نے اس کی محویت کو توڑنا مناسب نہ سمجھا۔ ابھی دس بھی نہیں بجے تھے

لیکن ایسے لگ رہا تھا جیسے آدھی رات ہو چکی ہو۔ اس راستے سے میں کم ہی کبھی ہاتھی گیٹ کی طرف گیا تھا۔ عام طور پر میں اپنی گلی سے نکل کر ہاتھی گیٹ کی طرف آتا، وہاں سے ہال گیٹ یا پھر رام باغ گیٹ تک۔ اور آگے جانا ہوتا تو پہلے سلطان ونڈ گیٹ، پھر چاٹی ونڈ گیٹ۔ امرتسر شہر کے گرد و نواح کا یہی ایک تصور میرے ذہن میں تھا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ کبھی کبھار اگر دوسری طرف جانا ہوتا تو ہاتھی گیٹ سے لوہ گڑھ گیٹ، پھر لاہوری گیٹ، اس سے آگے جانے کی کبھی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ ہاں، اس سے آگے تھا حکیماں گیٹ، گلوالی گیٹ اور پھر بھگتا نوالہ گیٹ، جہاں سے میں اب آ رہا تھا۔ میری رکشا جب لاہوری گیٹ کے پاس پہنچی تو میرے دل میں ڈر کا احساس اور بڑھ گیا، یہاں کچھ بھی واقع ہو سکتا تھا۔ میرے سر پر پگڑی ہونے کی وجہ سے کسی کو مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ تھوڑا آگے جا کر لوہ گڑھ گیٹ کے پاس سے میری رکشا جب گزر رہی تھی تو بائیں ہاتھ کی طرف مجھے درگیانہ مندر نظر آیا۔ اس وقت ہم اسے سیتل مندر کہا کرتے تھے۔ گھر میں جب بھی کسی کو خسرہ نکلتا تو اس مندر کی اہمیت اور بڑھ جاتی۔ اس مندر سے چرنامت (مقدس پانی) لا کر پہلے اس بچے کے منہ میں ڈالا جاتا، پھر اس کے بستر کے چاروں طرف چھڑکا جاتا۔ اس وقت جھائی جی (ماتا جی) کہا کرتے تھے۔ ''شفا بخشیں سیتلا ماتا، میرے بچے کو۔''

اب اس مندر کے نزدیک سے گزرتے ہوئے میرا دل کانپ رہا تھا۔ کوئی بھی سر پھرا مجھے رکشا سے نیچے اتار سکتا تھا۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ہاتھی گیٹ آیا تو میرے دم میں دم آیا۔ یہاں سے جو سڑک بیبے والے کنوئیں کی طرف جاتی تھی، اس میں ہماری گلی واقع تھی۔ اس گلی میں ہمارا مکان تو ابھی بھی تھا لیکن اس میں رہتا کوئی نہیں تھا۔ میں ہی کبھی کبھار اس گھر کا دروازہ کھولتا تھا۔ دروازہ کھولتے ہی دائیں ہاتھ والے طاق کے پیچھے جالے اتارنے والی چھڑی اٹھا لیتا۔ بجلی کا بٹن تھوڑا دور ہونے کی وجہ سے میں اندھیرے میں اس چھڑی کو ادھر ادھر گھماتا ہوا آگے بڑھتا۔ پھر بتی جلا کر دیکھتا کہ اس چھڑی کے سرے کے ساتھ کتنا جالا لپٹا ہوا ہے۔ اندرونی کمرے کا دروازہ کھول کر پہلے میں ٹیوب جلایا کرتا، پھر

اور جالے صاف کرتا۔ گزشتہ چار پانچ سالوں سے یہ گھر خالی پڑا تھا۔ گھر کا اور کوئی فرد رات کو وہاں سونے سے ڈرتا تھا۔ صرف میں ہی وہاں بے دھڑک ہوکر سوسکتا تھا۔ اپنے گھر میں ڈر کیسا؟ لیکن اب میں اپنے گھر کو آتے ہوئے بازار والوں اور محلے والوں سے ڈر رہا تھا۔

تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا، میں اپنے گھر کے چبوترے پر چڑھ گیا۔ جیب سے چابی نکال کر اسے ہوڑے میں گھمانے لگا۔ مجھے یہ بات کبھی بھی یاد نہیں رہتی تھی کہ چابی کو بائیں طرف گھمانا ہے یا دائیں طرف۔ پہلے دائیں پھر بائیں، اگر نہ کھلے تو پھر دائیں بائیں۔ اس طرح کرنے سے کچھ کھٹکا ضرور ہوا ہوگا۔ بغل کے مکان کی کھڑکی میں کھڑے کسی شخص نے کھنکارا۔ جلدی سے میں اوپر کی طرف جھانکا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ شاید وہ میرا پرانا دوست جگل کشوری تھا جو اب میرے ساتھ بات کرنے سے جھجک گیا تھا۔ اس وقت وہ بلی آنکھوں والا بہت خوبصورت ہوتا تھا۔ ہوسکتا تھا کہ وہ مجھے کھڑا دیکھ کر، میرے پاس آنے کے لیے اپنی نچلی سیڑھیاں اتر رہا ہو — اگر اس وقت ہوڑہ نہیں کھلتا تو ہماری طرف آجاؤ، بیری، لیکن کسی کے نیچے اترنے یا میرے ساتھ کوئی بات کرنے سے پہلے ہی ہوڑہ کھل گیا۔ جالے صاف کرنے والی چھڑی اٹھا کر میرے لیے آگے بڑھنا، اس طرح تھا جیسے میں کسی اندھیری گپھا میں جا داخل ہوا ہوں۔ اندھیرے میں ہی جالے صاف کرتا ہوا، تاکہ وہ میرے چہرے سے نہ چمٹ جائیں، میں بجلی کے بٹن تک پہنچ گیا۔ روشنی ہوتے ہی میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ میں صحیح سلامت اپنے گھر پہنچ گیا تھا — جی ہاں، اپنے گھر۔

اگلے دن صبح چھ بجے میری آنکھ کھل گئی۔ باہر ابھی تھوڑا اندھیرا تھا۔ کمرے کے اندر تو دن رات ایک سا وقت رہتا تھا۔، اتنا ضرور تھا کہ دن کے وقت اندرونی دروازے کے پاس دھوپ کی ہلکی سی چمک پڑتی تھی جس کی وجہ سے کمرے میں رکھی ہوئی چیزوں کے نقش ابھر آتے تھے۔ کمرے سے باہر نکلتے ہی دائیں ہاتھ کی طرف باورچی خانہ تھا۔ اس کمرے اور باورچی خانہ کے دروازے ایک چھوٹے سے صحن میں کھلتے تھے۔ اس صحن سے آگے گلی کی طرف ایک بیٹھک تھی جس میں ایک دیوار کے ساتھ دیوان رکھا ہوا تھا اور پاس ہی ایک میز اور دو کرسیاں پڑی تھیں۔ بوقت ضرورت ایک دو موڑھے بھی وہاں رکھے جا سکتے تھے۔ اس دیوان پر لیٹے لیٹے جھائی جی (ماتا جی) کی روح جسد خاکی سے پرواز کی تھی۔ جوڑوں کے درد کی وجہ سے وہ کئی سال اس دیوان پر پڑی رہیں۔ میں جب دو تین دنوں کے لیے گھر آتا تو صبح میری آنکھ کھلتے ہی جھائی جی کے کراہنے کی آواز میرے کانوں میں پڑتی۔ شاید میری آنکھ ہی ان کی ہائے ہائے کی وجہ سے کھلتی تھی۔ اس وقت میں سوچ میں پڑ جاتا کہ گھر کے افراد چاہے ان کے لیے اور کوئی بھی قربانی دے سکتے ہوں، لیکن رتی بھر ان کے درد کو بانٹ نہیں سکتے تھے۔

ایک بار اسی طرح جھائی جی (ماتا جی) کے تڑپنے کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی۔ یہی کوئی چھ ساڑھے چھ بجے کا وقت ہوگا۔ سردیوں کے دن تھے۔ کچھ دیر وہ ہائے ہائے کرتی رہیں، پھر ان کی آواز دھیمی پڑ گئی جیسے وہ کسی کے کانوں میں کہہ رہی ہوں — بیرے کے باؤ! باہر سے کوئلوں والی انگیٹھی اٹھا لاؤ۔ کوئلے اب اچھی طرح سلگ گئے ہوں گے۔ پراٹھوں کے لیے میں نے آلو ابالنے ہیں۔ ادرک اور پیاز میں نے کاٹ لیا

ہے۔ لڑکا اتنے عرصہ کے بعد گھر آیا ہے۔ ویسے تو رب کے فضل سے اس کے اپنے گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں، لیکن اسے میرے بنائے ہوئے آلوؤں کے پراٹھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ دوپہر میں مٹر پنیر اور دہی میں پکوڑیاں بناؤں گی۔ جلدی کرو نا انگیٹھی میں کوئلے سلگنے لگے ہیں۔ آگ کا سینک ضائع جا رہا ہے اور مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھاؤ۔ یہاں لیٹے لیٹے تو میری ہڈیاں بھی دکھنے لگی ہیں۔ میرا بازو اتنے زور سے نہ کھینچو۔ آپ نے تو میرا شانہ ہی دکھا دیا۔ چھوڑو، میرا ہاتھ — ہائے، ئی میں مرگئی — ہائے!"

یہ بات تو اب تین چار سال پرانی تھی۔ عرصہ سے بیٹھک ان کے وجود سے خالی ہو چکی تھی۔ دیوان پر پہلے کی طرح ہی چادر بچھی ہوئی تھی۔ باقی ماندہ سامان بھی ویسے کا ویسے وہیں پڑا تھا۔ جب وہ زندہ تھیں تو ان کا دکھ دیکھا نہیں جاتا تھا۔ اس وقت خیال آتا تھا کہ پتا نہیں انھوں نے کتنا دکھ اور برداشت کرنا ہے۔ اب میرا دل کر رہا تھا کہ ان کی آواز میرے کانوں میں پڑے، چاہے کراہنے یا تڑپنے ہی کی ہو لیکن نہیں، وہاں مکمل خاموشی تھی اور تو کوئی زیادہ فرق نہیں پڑا تھا لیکن باؤجی گھر سے بے گھر ہو گئے تھے۔ چار بیٹے، کبھی ایک کے پاس، کبھی دوسرے کے پاس۔ یوں تھا جیسے — "رہنے کو گھر نہیں ہے سارا جہاں ہمارا" ایک گھر چھوڑا تو چار مل گئے۔ ہر گھر کا نیا انداز، نئے اصول۔ دل کی بات دل میں لیکن ماتھے پر شکن نہیں۔ یہ گلی چھوڑنے کو ان کا دل نہیں چاہتا تھا لیکن چھوڑنی پڑی۔ نہ چھوڑتے تو کیا کرتے؟ کون پکا پکا کر کھلاتا؟

اس طرح سوچتے سوچتے سات بج گئے۔ چادر پرے ہٹا کر میں پلنگ سے نیچے اترا۔ کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر صحن میں آ گیا۔ اوپر دیکھا تو منڈیر پر دھوپ کا عکس دکھائی دیا۔ آسمان وہاں سے بہت دور ظاہر ہوا۔ یوں تھا جیسے میں کنوئیں کی گہرائی سے آسمان کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ اس طرح ظاہر ہوا جیسے زمین اور آسمان کے فاصلے میں ڈھائی منزلہ مکان کی اونچائی جتنا اضافہ ہو گیا ہو۔ میں نے ایک نظر آسمان کو پھر دیکھا، یوں اوپر کی طرف دیکھنا مجھے غنیمت لگا۔ کیا معلوم کب یہ نظارہ بھی چھن جائے۔ آہ سی بھر کر میں نے باورچی خانہ کی کنڈی کھولی۔ سامنے شیلف پر ضرورت کی ہر چیز پڑی تھی —

سٹوو، چائے پتی، چینی، کیتلی، گلاس، چمچے لیکن دودھ نہیں تھا، چائے کیسے بنتی؟ دودھ لینے کے لیے گلی کے باہر جانا ضروری تھا۔ گلی کے سرے پر ہی حلوائی کی دکان تھی لیکن وہاں جائے کون؟ ننگے سر تو میں کبھی گلی سے باہر گیا نہیں تھا۔ یہ بات بھی نہیں کہ کبھی گزرا ہی نہیں تھا۔ چھوٹے ہوتے تو سر سے بھی ننگے اور پاؤں سے بھی ننگے۔ گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے جب جُوڑا کھل جاتا تو میلے ہاتھ نیکر کے ساتھ صاف کر کے جُوڑا باندھ لیتا تھا۔ وہ زمانہ تو کافی گزر چکا تھا۔ وہ یار دوست بھی اب نظر نہیں آتے تھے۔ کچھ تو اس گلی ہی میں تھے لیکن وہ اب مجھے پہچانتے نہیں تھے۔ نہیں، یہ بات بھی نہیں۔ پہچانتے تو ضرور تھے لیکن بات چیت نہیں کرتے تھے۔ اس لیے کہ ہمارے درمیان اب کوئی تعلق نہیں تھا۔ تبادلۂ خیال کرنے کے لیے مشترکہ موضوع نہیں تھا۔ پرانے میل جول پر وقت کی دھول جم چکی تھی۔ جو بات بیس پچیس سال پہلے تھی، اب کیسے ہوسکتی تھی؟

چائے کی طلب بڑھ رہی تھی۔ ننگے سر گلی سے گزرنا مناسب نہیں تھا۔ نائٹ سوٹ میں سر اوپر پگڑی رکھ کے باہر جانا اور بھی مضحکہ خیز بات تھی۔ دودھ کے بغیر چائے، جیسے گناہ بے لذت۔ پھر خیال آیا کہ چائے تایاجی کے گھر جا کر پی لی جائے۔ سامنے ہی تو ان کا گھر تھا۔ اپنی خوشی سے اکیلے رہ رہے تھے۔ شاعر کو آزادی کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر یہ بھی تو تھا کہ — 'ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو'۔ وہی بھایاجی والا گھر تھا کبھی اس میں بڑی رونق ہوتی تھی۔ چہل پہل، بھاگ دوڑ، گہما گہمی، لیکن اب دنیا بدل چکی تھی۔ بھایاجی جاچکے تھے۔ ان کے بچوں کے بچے بھی جوان ہوگئے تھے۔ پھر تائی جی انتقال کر گئیں۔ بعد میں پرانا نوکر ملکھی رام بھی چل بسا۔ اب تو تایاجی کا دم غنیمت تھا۔ وقت اپنی عادت کے مطابق لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا جارہا تھا۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا تھا — ''وقت کی رفتار کون روکے گا؟''

میں اپنے چبوترے پر کھڑا ہوگیا۔ چبوترے کے نیچے گزرتی نالی بند تھی۔ نالی سے نکل نکل کر پانی باہر بہہ رہا تھا۔ ایک پہچانی بدبو میری ناک تک پہنچی۔ میرے جسم میں جھن جھن سی ہوئی۔ جانی پہچانی ہونے کے باوجود مجھے اجنبی سی لگی۔ ناک کو ذرا ملتے ہوئے میں نے

دوسری طرف دیکھا۔ ساتھ والے گھر کے چبوترے کے پاس ایک بچی سوراخ کے کنارے بیٹھی تھی۔ اسی چبوترے کے دوسری طرف اس کا چھوٹا بھائی اسی حالت میں بیٹھا تھا۔ میں جب اپنے چبوترے کی دو سیڑھیاں اتر کر گلی میں گیا تو ان دونوں بچوں نے میری طرف دیکھا۔ چھوٹا لڑکا تو گھبرا کے اٹھ کھڑا ہوا اور دونوں ہاتھوں میں پکڑے اپنی قمیض کو اور اوپر اٹھا لیا۔ اتنے میں اس کی ماں نے کھڑکی سے آواز دی "ہنو ابھی بیٹھ جاؤ، اچھی طرح کر کے آنا۔" میں نے اوپر دیکھا پیٹی کوٹ اور بلاؤز میں ایک عورت، کھڑکی کی اگلی سلاخ پر ایک پاؤں رکھے، نیچے کی طرف جھکی ہوئی تھی۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ برکھی کے چھوٹے بیٹے سنیل کی بیوی تھی۔ میں اسے بنا مطلب ہی پوچھ بیٹھا، "سنیل کہاں ہے؟" اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور پھر تھوڑا جھجکتے ہوئے بولی، "نیچے غسل خانے میں نہا رہے ہیں۔"

تایا جی کے مکان کی تین سیڑھیاں چڑھ کر میں نے ڈور بیل دبائی۔ اتنے میں برکھی کھانستا ہوا اپنے چبوترے پر آ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں مسواک تھی جسے وہ زور زور سے چبا رہا تھا۔ وہ بدن سے ننگا تھا اور جسم میں پٹے دار کپڑے کا کچھا پہنا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنے گلے کو اچھی طرح صاف کیا اور مسواک کو دروازے کی چوکھٹ کے ساتھ جھاڑتے ہوئے پوچھنے لگا—

"کب آیا تھا، بیری؟"

"کل رات—"

"پتا نہیں لگا۔"

"میں اندھیرا ہوتے ہی آیا تھا۔"

"آج کل تو جلدی ہی گھر آ جانا چاہیے۔"

"کسی دوست کے یہاں رات کا کھانا کھایا تھا، بس باتوں باتوں میں دیر ہو گئی۔"

"کیوں، کھانا ہماری طرف نہیں کھا سکتا تھا؟"

"نہیں برکھی، یہ بات نہیں۔"

"اچھا پھر، ناشتہ تو ہماری طرف کرنا۔"

"کوئی بات نہیں، ناشتہ میں ادھر تایا جی کے ساتھ کرلوں گا۔"

"کیوں تکلیف دیتا ہے ان کو؟ پھر بھی میں کہوں گا باؤ جی ہمتی بہت ہیں۔ دودھ کی تھیلی لینے وہ صبح مجھ سے پہلے بوتھ پر پہنچے ہوتے ہیں اور بات سن، تمھارے گھر کا تالا لگا رہتا ہے۔ اپنے بھائی سے کہونا کہ واپس آجائے۔"

"اب مشکل ہے، اس کی بیوی ویر کا سکول میں پڑھاتی ہے، پیچھے بچوں کو سنبھالنے والا کوئی نہیں۔ وہاں رہنے سے انھیں بہت آسانی ہے۔"

"وہ تو تمھاری بات ٹھیک ہے لیکن بند مکان بھی تو اچھا نہیں ہوتا۔ پھر رونق تو بندوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ سنیل کے بچے سنی اور جیوتی کے ساتھ بہت کھیلتے تھے۔"

"دیکھ لے برحمی، وقت کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ پہلے ہم بچے تھے — پھر ہمارے بچے ہوئے — اب بچوں کے بچے۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہے، بیری۔ ان بچوں کے باپ ہمارے لیے بچے ہی ہیں — چاہے وہ یہ بات مانیں یا نہ مانیں۔"

"مانیں کیوں نہیں برحمی، ان کے باپ بھی مانیں گے۔"

اس بات پر ہم دونوں ہنس پڑے۔ ہنستے ہنستے برحمی کو کھانسی آگئی۔ اس نے فوراً بلغم گلی میں تھوکا اور مسواک منھ میں ڈال کر ڈیوڑھی میں چلا گیا۔ اس کا پوتا اور پوتی پتا نہیں کب وہاں سے کھسک گئے تھے۔ ان کی کارستانی کچھ تو نالی کے کنارے پر پڑی تھی اور کچھ نالی میں۔ ایک مرتبہ پھر میں نے ڈور بیل دبائی۔ ہوڑے کی رسی کو اوپر کھینچنے کی آواز آئی۔ دروازہ کھول کر میں اندر چلا گیا۔ ڈیوڑھی میں تین چار قدم چلنے کے بعد میں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ میرا ہاتھ اپنے آپ لکڑی کے جنگلے کے اوپر تھم گیا۔ ہاتھ کو جنگلے سے کھسکاتا ہوا میں ایک ایک سیڑھی چڑھنے لگا۔ کوئی وقت تھا کہ جنگلے کے اوپر ہاتھ رکھے بغیر ایک ایک سیڑھی چھوڑ کر دوڑتے ہوئے اوپر چڑھتا تھا۔ اب تو بلکہ دل کرتا تھا کہ بھایا جی کی طرح پہلے دونوں پاؤں ایک ہی سیڑھی پر رکھے جائیں، پھر ایک پاؤں اگلی سیڑھی پر، بعد میں

دوسرا ابھی اسی سیڑھی پر، لیکن میرے لیے ایسا کرنا بہت جلدی ہار ماننے والی بات تھی۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ایک گھٹنے میں درد محسوس ہوا۔ پھر یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں اس ہلکے سے درد کے سہارے ہی سیڑھیاں چڑھتا جا رہا ہوں۔ پہلی چھت پر پہنچ کر میں نے نچلی سیڑھیوں کی لائٹ بند کر دی۔ اتنے میں تایا جی نے اوپری سیڑھیوں کی لائٹ کا اوپر کا سوئچ دبایا۔ اوپری چھت کی پہلی سیڑھی پر پاؤں رکھنے سے پہلے میں بھائیا جی کے کمرے میں چلا گیا۔ ایک طرف، کھڑکی کے پاس تخت پوش بچھا ہوا تھا۔ سرہانے کی طرف گاؤ تکیہ پڑا تھا، جس کے اردگرد کچھ رسالے اور کتابیں پڑی تھیں۔ کمرے کی دائیں جانب صوفہ سیٹ لگا ہوا تھا۔ اس کے اوپر الم غلم پڑا تھا۔ جگہ جگہ پر کبوتروں کے پر اور بیٹیں بکھری پڑی تھیں۔ ایک کونا میں جالا لگا ہوا تھا۔ اس جالے میں پھنسی ہوئی مکڑی کو دیکھ کر مجھے ایک مصرع یاد آ گیا:

لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

یہ مصرع گنگناتے ہوئے میں اوپری سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

اوپری سیڑھیوں کا درمیانی موڑ مڑتے ہی میں نے اوپر دیکھا۔ سامنے تایا جی کھڑے تھے۔ ہلکی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہنے لگے — واہ واہ، یہ تو کمال ہو گیا۔'' میں نے انھیں ہاتھ جوڑے، لیکن انھوں نے میرے ہاتھوں میں ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، ''بیری، میں تمھیں کئی دنوں سے یاد کر رہا تھا۔ رات گئے آیا ہوگا، نہیں تو مجھے ہی پتا لگ جاتا تھا۔ یہاں جا کر کرسی پر تولیہ اٹھا کر کرسی کی پشت پر ڈال دے۔ پہلے میں چائے تیار کرتا ہوں، میں نے ابھی پی ہے اور سناؤ، سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟''

''ہاں جی، سب ٹھیک ہے۔'' میری سانس ابھی بھی پھولی ہوئی تھی۔ دو چھتیں چڑھنے کے بعد کتنی کتنی دیر میری سانس پھولی رہتی تھی۔ شاید اس لیے کہ مجھے اب سیڑھیاں چڑھنے کی عادت نہیں رہی تھی۔

تایا جی ٹلّو کے پاس بنے باورچی خانہ میں چلے گئے۔ میں بیٹھک کا جائزہ لینے لگا۔ دو بڑے بڑے تخت پوش، ساتھ ساتھ جڑے ہوئے، ڈبل بیڈ کا کام دینے کے لیے۔

سرہانے کی جانب رسالے، کتابیں، کاغذ، چٹھیاں، ڈائری، گھڑی، ٹارچ، بال پین اور کتنا کچھ پڑا تھا۔ ایک جانب کونے میں میز پر پورٹیبل ٹیلی ویژن رکھا ہوا تھا۔ کارنس بھی پوری طرح بھری پڑی تھی — ٹائم پیس، فلکس، برش، ہارلکس، آئی ڈراپس، بی کمپلیکس کے کیپسولز، وینس کا مجسمہ، کمانی دار اسٹینڈ والا شیشہ کچھ اور چھوٹا موٹا ساز و سامان، دیواروں پر کیلنڈر، اس سال کے، گزشتہ سال کے، کیلنڈروں کے نیچے کیلنڈر، وال کلاک، کک اینڈ کیلوے، کی ایک اور سیلوں کے ساتھ چلنے والی، ٹِک ٹِک کی آوازیں، لگاتار — جیسے ماضی اور حال ایک دوسرے میں کھوگئے ہوں۔

''لے پکڑ چائے، چینی میں نے کم ہی ڈالی ہے۔''

''چائے میں بہت زیادہ چینی مجھے اچھی نہیں لگتی، ویسے میں میٹھی چیزوں کا شوقین ہوں۔''

''ٹھیک وقت پر یاد کروادیا ہے۔ دیسی گھی کی پنیوں کا ڈبہ کئی دنوں سے پڑا ہوا ہے۔ میں ترے واسطے لاتا ہوں۔''

تایاجی اپنا گلاس تخت پر پڑی ٹرے میں رکھ کے باورچی خانہ کی جانب چلے گئے۔ مکھ کی دائیں طرف کنستر پر پنیوں کا ڈبہ پڑا تھا۔ اس میں سے تین پنیاں وہ ایک پلیٹ میں رکھ کر لے آئے —

''لے پکڑ، یہ تمھارے لیے ہیں۔''

''نہیں نہیں، ایک سے زیادہ میں نہیں کھا سکتا۔''

''چل، ایک میں لیتا ہوں، باقی دونوں تمھاری۔''

بادام کی موٹی گری والی ایک پنی میں نے اٹھالی۔ پنی کھاتا ہوا میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ سامنے ہمارا مکان تھا جس کی چھت پر ٹوٹا ہوا فولڈنگ بیڈ، بچی ہوئی لکڑی اور ایک دو اور ٹوٹی ہوئی چیزیں پڑی تھیں۔ یہ گھر ہم پوری طرح تیار نہیں کروا سکے تھے۔ پہلے پیسوں کی کمی کی وجہ سے، پھر سیمنٹ کی کمیابی کی بدولت۔ اس کے ساتھ والا مکان ہی اصل میں ہمارا مکان تھا۔ اگرچہ اسے اب ہم فروخت کر چکے تھے۔ اس پرانے مکان میں ہی

سب کچھ ہوا، سب کچھ بیتا۔ ہمارا قیام اس مکان میں آدھی صدی سے زیادہ رہا تھا۔ میری پیدائش اگرچہ ترنتارن، اپنے ننھیال ہوئی تھی لیکن اپنی زندگی کے پہلے بائیس سال میں نے یہیں گزارے تھے۔ سن سینتالیس کا دکھ درد بھی اسی گھر میں رہتے ہوئے برداشت کیا۔ بعد میں نوکری کے سلسلے میں، میں جب اس شہر سے باہر گیا تو اس گھر کی یاد بھی میرے ساتھ گئی۔ اوپری چھت والی دیواروں پر لگیں گلاب کے سرخ پھولوں والی ٹائیلوں والا کمرہ میری شخصیت کا حصہ بن چکا تھا۔ اسی کمرے میں میں لکھتا پڑھتا، سوتا جاگتا رہا، روشن مستقبل کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ اب پھر وہی کمرہ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس میں ایک بیڈ بچھا ہوا تھا۔ اس پر دو بچے سوئے ہوئے تھے۔ تھوڑا سا سر جھکا کر میں سامنے کی دیوار کی ٹائیلوں کو دیکھ سکتا تھا۔ گلاب کے پھول ابھی بھی سرخ تھے، ان کی پتیاں اب بھی ہری تھیں۔ ابھی تک کچھ بھی نہیں بدلا تھا—

''کیا دیکھ رہا ہے، بیری؟''

''کچھ نہیں تایا جی۔''

''تم لدھیانہ میں اس سے بڑھیا مکان بنا لینا۔''

''شاید — لیکن وہ اس طرح کا نہیں ہوگا۔''

''اگر بیری، یہ مکان چھوٹا نہ ہوتا تو تمھیں اسے چھوڑنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔''

''یہ ساتھ والا مکان بڑی سوچ سمجھ کر خریدا تھا، پورا ڈھانچہ بھی کھڑا کرلیا تھا لیکن مکمل نہ کروا سکے۔''

''آہستہ آہستہ اس گلی میں تمھاری دلچسپی بھی تو کم ہوگئی تھی۔''

''اب بڑا عجیب سا لگ رہا ہے، تایا جی۔''

''لے سن، اس طرح کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہوا میرا ایک شعر:

روشن انجام سفر ہوگیا سب پہ میرا
میں جو لوٹا ہوں تو ملتا نہیں اب گھر میرا

''ٹھیک کہا ہے، آپ نے۔ اب تو میرا حال ن م راشد کی نظم 'ایران میں اجنبی' جیسا ہے، بلکہ اس سے بھی بدتر، کیونکہ میں اب اپنے ہی ملک میں اپنے آپ کو اجنبی سمجھنے لگا ہوں۔''

''چلو چھوڑو، بیری، ان باتوں کو، میں اس گلی میں گزشتہ پچاس سالوں سے بلکہ ساٹھ ہی ہونے کو ہیں، رہ رہا ہوں، اس سے پہلے کہ محلے والے مجھے پہچاننے سے انکار کریں، میں ہی ان کو پہچاننے سے انکار کر چکا ہوں۔''

میں نے ان کی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور کرسی سے اٹھ کر کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ دو گھر چھوڑ کر ایک عورت دھلے ہوئے کپڑے سکھانے کے لیے ڈال رہی تھی۔ وہ ایک ایک کپڑا جھٹک کر رسی پر لٹکا رہی تھی۔ کچھ کپڑے ڈالنے کے بعد اس نے میری طرف دیکھا۔ جلدی ہی اس نے پیٹھ موڑ لی اور دیگر کپڑے جھٹکنے لگی۔ وہاں سے نظریں ہٹا کر میں نے ست کے مکان کی طرف دیکھا۔ وہ اوپری سیڑھیوں میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ عام طور پر وہ 'پنجاب کیسری' یا 'ہند سماچار' ہی پڑھا کرتا تھا۔ بچپن میں، ست ایک دن مجھے کہنے لگا—

''بیری، اگر تم اس سال فیل ہو جاؤ تو ہم ایک ہی کلاس میں ہو جائیں گے۔''

''تم میرے اچھے دوست ہو۔''

''میں نے ویسے ہی کہا ہے، میری بات کا برا مت ماننا۔''

''ست، ہم ایک ہی اسکول میں پڑھتے ہیں، ایک گلی میں رہتے ہیں اور شام کو اکٹھے کھیلتے ہیں۔ یہی بہت ہے۔''

''لیکن اب تو گلی کے زیادہ لڑکے میرے ساتھ کھیلنے سے جھجکتے ہیں، پتا نہیں کیوں؟''

''تجھے اس بات کا پتا نہیں؟''

''نہیں، بیری۔''

پرسوں ہم درگا اشٹمی کے موقع پر درگیانہ مندر گئے تھے نا۔ درگا اشٹمی کے موقع پر۔ باقی مندروں میں ماتھا ٹیک کر ہنومان کے مندر میں چرنامت (مقدس پانی) لینے چلے گئے

تھے۔"

"یاد ہے مجھے، ہم نے جس کو چرنامت سمجھ کر پیا تھا، وہ اصل میں بھنگ والے دودھ کی لسی تھی۔ پیاسے ہونے کی وجہ سے ہم دو لسی ہاتھوں میں انڈیل کے ہی پی گئے اور پھر جھومتے ہوئے پاتھی گراؤنڈ کی طرف چلے گئے۔"

"اونچی اونچی بولتے ہوئے جب ہم ادھر جا رہے تھے تو تمھاری بڑی بہن نے ہمیں دیکھ لیا اور تمھارے پیچھے پیچھے آ گئی۔"

"پتا ہے کیوں؟ وہ مجھے آوارہ گردی کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔" "وہ تو ٹھیک ہے، ست، لیکن جب اس نے تجھے جھڑکا کہ تو ان لڑکوں کے ساتھ کیوں پھرتا ہے؟ جو سارا دن گلی بازاروں میں گھومتے رہتے ہیں، تو انھوں نے یہ بات سن لی۔"

"تجھے پتا ہے، بیری، یہ لڑکے سارا دن بازار میں یا تو پنجا (پہیہ) چلاتے رہتے ہیں یا برانٹے کھیلتے رہتے ہیں یا پھر تاش کی بازی لگا لیتے ہیں اور رات آنے پر یہ کبڈی کھیلنے لگ جاتے ہیں۔ پڑھنے میں ان کی کوئی دلچسپی نہیں۔"

"ہو بھی کیوں؟ بیٹھنا تو انھوں نے دکانوں پر ہی ہے۔ کوئی ساتویں میں فیل ہو کر بیٹھ جائے گا، کوئی آٹھویں یا نویں میں، دسویں تک تو کسی نے پہنچنا ہی نہیں۔"

"اچھا — وہ بات جو تو بتا رہا تھا درمیان میں ہی رہ گئی۔ یہ لڑکے میرے ساتھ روٹھے کیوں ہوئے ہیں؟"

"ست، تمھاری بہن نے جب کہا کہ تم بے کاروں کے ساتھ پھرتے ہو تو تم نے جواب دیا تھا، بیری تو پڑھنے والا ہے۔ یہ بات سن کر وہ بھی لڑکے ہم دونوں کو پیچھے چھوڑ کر خود آگے نکل گئے تھے۔"

"چلو ان کو دفع کرو، مجھے ویسے بھی اچھے نہیں لگتے۔ گلی میں لنگوٹیاں باندھے پھرتے رہتے ہیں۔ جب دل نے چاہا نالی کے کنارے بیٹھ گئے، یہ نہیں دیکھنا کہ کون آ رہا ہے، کون جا رہا ہے۔"

"مجھے تو ست، ان سے شوراتری والے دن سے ایک اور شکایت بھی ہے۔"

''پتا ہے مجھے، اوم سودائی نے تمھارے ہاتھوں پرشوا کا پرشاد کہہ کر تمبا کو رکھ دیا تھا۔''
''پھر میں نے بھی اسے اچھا سبق سکھایا تھا۔''
''ہاں، بیری، تم بہت دیر تک گلی کے باہر کشتی لڑتے رہے تھے۔ کبھی تو اس کو چت کر دیتا، کبھی وہ تجھے، پھر اس کی نکسیر پھوٹ پڑی اور روتا ہوا وہ اپنے گھر دوڑ گیا۔''
''اس وقت میں بہت ڈر گیا تھا کہ اب بات بڑوں تک پہنچ جائے گی۔''
''اگر تمھارا چھوٹا چچا چھٹی پر نہ آیا ہوتا تو بات بہت بڑھ بھی جاتی تھی۔ فوج میں ہونے کی وجہ سے اس کا دبدبہ گلی والوں پر بہت تھا۔''
اس وقت کھڑکی میں کھڑے کھڑے مجھے یہ باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اخبار کا ورق پلٹتے ہوئے ست نے میری طرف دیکھا۔ ہاتھ کے اشارے کے ساتھ اس نے میرا حال چال پوچھا۔ ہاتھ کے اشارے کے ساتھ ہی میں نے اسے جواب دیا۔ وہ دوبارہ اخبار پڑھنے میں مصروف ہوگیا۔ آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے اس کے سر کے بالوں کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے تایا جی سے کہا۔
''کوئی تین سالوں تک ست بھی ریٹائر ہو جائے گا۔''
''یہ تجھ سے کوئی سال بھر تک ہی چھوٹا ہوگا؟''
''ہاں، تایا جی، ایک بار مجھے کہتا تھا کہ اگر میں فیل ہو جاؤں تو پھر ہم ایک کلاس میں ہو جائیں گے۔ اس وقت اگر میں اس کی بات مان لیتا تو پھر اب ہم اکٹھے ہی ریٹائر ہوتے۔''
''وہ کیسے؟'' تایا جی نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ مجھے مسکراتا ہوا دیکھ کر وہ بھی مسکرانے لگے۔ پھر اپنے گلاس سے چائے کا آخری گھونٹ پیتے ہوئے کہنے لگے۔
''اگر اس طرح ہو سکتا تو پھر میں بھی چوبیس پچیس سال پہلے اسکول کی نوکری سے ریٹائر نہ ہوتا۔''

3

تایا جی کے ساتھ ناشتہ کر کے میں اپنے گھر لوٹ آیا، تھوڑی دیر بعد میں نہانے چلا گیا۔ ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے کہ میں ناشتہ پہلے کروں اور غسل بعد میں۔ تایا جی جالندھر جانے کی جلدی میں تھے۔ انھیں وہاں دوردرشن میں اپنا پروگرام ریکارڈ کروانا تھا۔ اپنے ناشتے کے ساتھ انھوں نے میرا ناشتہ بھی تیار کرلیا ہے۔ اب اپنے غسل خانے میں نہاتے ہوئے میں بڑی تسلی محسوس کر رہا تھا۔ بڑے تسلے میں پانی کے مگ بھر بھر کر میں جسم پر ڈال رہا تھا۔ پورے کھلے ہوئے نلکے سے پانی کی موٹی دھار تسلے میں گر رہی تھی۔ لگاتار، مسلسل جلدی جلدی نہانے کی وجہ سے تسلے والا پانی ختم ہوگیا۔مگ کو میں نے نلکے کی دھار کے نیچے رکھ کر بھرا اور اپنے منھ پر ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد میں تولیے سے جسم پونچھنے لگا۔ نلکے میں پانی کی دھار اسی بلند آواز کے ساتھ تسلے میں گر رہی تھی۔ پھر یہ آواز مدھم ہوتی گئی اور اس طرح ظاہر ہونے لگا جیسے پانی کی دھار تسلے میں غوطے مار رہی ہو۔

بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر کسی نے ڈور بیل کا سوئچ دبایا۔ جلدی جلدی کپڑے پہن کر میں غسل خانے سے باہر آگیا۔ دو تین لمبے ڈگ بھرتے ہوئے میں نے بیرونی دروازہ کھول دیا۔ باہر تایا جی چبوترے پر کھڑے تھے، ''اچھا پھر بیری — میں اب چلا، شام تک لوٹ آؤں گا۔''

''ٹھیک ہے جی، اب میں بھی چلا، دو تین جگہوں پر جانا ہے۔''

''ہمارے گھر کی چابیاں رکھ لے، کوئی کتاب وغیرہ پڑھنی ہوگی یا ٹی وی دیکھنا ہوگا۔''

''نہیں جی، ضرورت نہیں — گھر لوٹتے مجھے بھی شام ہوجانی ہے۔''

''اچھا پھر — میں چلتا ہوں۔''

وہ ہمارے چبوترے کی دو سیڑھیاں اتر گئے۔ وہی لباس، وہی چال ڈھال، یہ مکان، یہ کمرے اور ان میں رہنے والے اشخاص۔ ہر کوئی صبح سے شام تک حرکت میں تھا۔ پھر رات، نیند، خواب۔ صبح پھر ہلچل، آوازیں، شور شرابہ۔ بچے اور ان بچوں کی مائیں، عورتیں اور عورتیں، مرد اور زیادہ مرد۔ ایک سلسلہ، ایک چکر۔

پتا نہیں کیوں میں ابھی تک چبوترے پر کھڑا تھا۔ تایا جی کب کے گلی کا موڑ مڑ چکے تھے۔ یہ موڑ، گلی کا یہ موڑ، میرے لیے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ میں جب یہ موڑ مڑ جاتا تو اپنے گھر کی بجائے، باہر کی دنیا کے ساتھ میرا رشتہ جڑ جاتا۔ واپس آنے پر گلی کا یہ موڑ میری سوچ کو گھر کے ساتھ جوڑ دیتا۔ میری ذہنیت اس موڑ کے تئیں بھی بڑی عجیب تھی۔ اس موڑ پر میں ایک مرتبہ لڑکوں کے ساتھ لڑتا ہوا گرا بھی تھا۔ کسی لڑکے نے مجھے دھکا دیا اور میں نالی کے کنارے پر گر پڑا۔ میرے کولہے پر بہت زور کی چوٹ لگی اور میں رونے لگ پڑا۔ ایک لڑکے نے مجھے اٹھانے کی کوشش کی لیکن مجھ سے اٹھا نہیں گیا۔ پھر دو تین لڑکے مجھے بانہوں سے پکڑ کر گھسیٹنے لگے۔ دور تک وہ مجھے گھسیٹتے گئے۔ اس وقت کی بے بسی مجھے ابھی یاد تھی اس طرح تھی جیسے میرے چہرے پر گلی دوالا چار نگاہیں کچھ تلاش کر رہی ہوں، کچھ پہچان رہی ہوں۔

ایک جھٹکے کے ساتھ میں چبوترے سے اندر کی جانب مڑا۔ پچھلے کمرے میں جا کر اپنی داڑھی پر برش پھیرنے اور فکسر لگانے لگا، مونچھ وٹ کے ساتھ مونچھوں کو تاؤ دینے لگا۔ یہی دو تین کام مشکل تھے، باقی تیاری میں بہت زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔ پگڑی باندھی بندھائی پڑی تھی۔ آخر میں دو ہی کام تھے — پگڑی کو سر پر رکھنا اور پاؤں میں بوٹ ڈالنا۔ یہ دونوں ختم ہوتے ہی باہر جانے کی جلدی۔ پہلے گلی کا موڑ، پھر گلی کا گیٹ اور پھر گیٹ سے باہر۔ وہاں سے دائیں یا بائیں — دائیں کا مطلب بیبے والے کنوئیں کا چوک اور بائیں کا مطلب ہاتھی گیٹ۔

اس دن میرے پاؤں دائیں طرف مڑ گئے۔ پہلے بیبے والا کنواں، پھر چوک پاسیاں، گورو بازار، درشنی ڈیوڑھی، بازار مائی سیواں، گھنٹہ گھر دربار صاحب، گھنٹہ گھر چوک میں پہنچ

کر میں نے ہرمندر صاحب کی طرف دیکھا۔ اس کے کلس پر سنہری چمکتی دھوپ دیکھ کر دل کو حوصلہ ملا۔ واہ گرو، سچا پاتشاہ، اپنے نواس استھان پر تشریف فرما تھے۔ وہ چوکھٹ جہاں میں سالوں تک ماتھا ٹیکتا رہا تھا ابھی بھی قائم تھی۔ اسکول کے دنوں میں ننگے پاؤں گھر سے چلنا، راستہ یہی، بس تھوڑا سا فرق۔ اس وقت درشنی ڈیوڑھی سے بازار مائی سیواں کی جانب جانے کی بجائے، چھوٹے بازار میں سے، تھڑا صاحب کی طرف جانا، تھڑا صاحب کے پاس سے گزر کر پانی کے چبچہ میں پاؤں دھونے، پھر سیڑھیاں اور سیڑھیاں، پہلے اکال تخت کے درشن، پھر ہرمندر صاحب کے پرکرما کرتے ہوئے پہلے بابا کی بیری، پھر دکھ بھنجنی بیری۔ منجی صاحبؒ کی طرف ہوتے ہوئے پھر پرکرما میں، بابا دیپ سنگھ کے سیس (سر) گرنے والے مقام کو ماتھا ٹیک کر نشان صاحب کے پاس، تھوڑی دیر کے لیے ایک طرف بیٹھ جانا۔

لیکن اب تو بات ہی کچھ اور تھی۔ تھڑا صاحب ملبے کا ڈھیر بن چکا تھا۔ اکال تخت کی عمارت منہدم ہوگئی ہے۔ ہرمندر صاحب کی ڈیوڑھی کے دائیں طرف پوشا کے رکھنے والے کمرے کی دیواروں میں توپوں نے چھید ڈال دیے تھے۔ یہاں تک کہ ہرمندر صاحب کے سنہری گنبدوں اور دیواروں پر بے شمار گولیوں کے نشان تھے۔ تالاب کا پانی غلیظ ہوگیا تھا۔ مچھلیاں کہیں بھی نظر نہیں آرہی تھیں۔ اس میں جابجا کائی اُگی ہوئی تھی، کبوتر ادھر ادھر حیران پریشان اڑ رہے تھے۔ اداسی اور گہری ہوگئی معلوم ہوتی تھی۔ میرے دل میں ہوک اٹھی۔ یہ کیا ہوگیا تھا؟ یہ کیا ہو چکا تھا؟ یہ کس جرم کی سزا تھی؟ کہاں تھے حکم چلانے والے؟ یہ تکلیف، یہ ہماری تکلیف — کب تک؟ کون سمجھے گا، کون سلجھائے گا یہ گتھی؟ کسی کے پاس فرصت نہیں، نہ ہی کوئی ناراضگی ہے ان کو بلکہ شادیانے بج رہے ہیں وہاں۔ 'دیرآید درست آید' اچھا سبق سکھایا انھوں نے اپنے آپ کو نیارے سمجھنے والوں کو۔ اب یہ سو سال اپنا سر نہیں اٹھا پائیں گے، بلکہ کئی سو سال تک۔ ادھر ادھر شرمندہ اڑ رہے تھے۔ ہوا میں تھوڑی ہلچل ہوئی، رکی ہوئی فضا نے جھن جھنی محسوس کی، ایک ولولہ جاگا، ایک تصور ابھرا اور پھر نیچے گرا اپنی جیت کروں، وائی ارداس۔

جلد ہی میں گھنٹہ گھر کی طرف سے باہر نکل آیا۔ جوتے پہن کر بازار مائی سیواں کی جانب چل پڑا۔ سامنے میرے دو پرانے دوست، ملہوترہ اور ورما آتے ہوئے دکھائی دیے۔ اچانک میرے اندر کی ناراضگی ان پر امڈ پڑی۔

''دیکھ لو، ملہوترہ صاحب اپنی سرکار کے کارنامے؟''

''سرکار ہماری بھی اتنی ہی ہے، جتنی کہ تمھاری۔'' انھوں نے جواب دیا۔

''اب تو یہ بس تمھاری ہی ہے، ہماری بالکل نہیں''، میں نے طنزیہ کہا۔

''کیوں تم سرکاروں کے چکر میں پڑ گئے ہو، بیری۔ ہم نے پہلے کس کی حامی بھری ہے؟'' ورما صاحب نے تھوڑا چڑ کر کہا۔

''وہ وقت اور تھا، ورما صاحب، انگریز کا راج تھا، لوٹ کھسوٹ تھی، اجارہ داری تھی، ظلم تشدد تھا، لیکن اب تو یہ ہماری سرکار تھی، ہماری منتخب سرکار، پھر اس نے اتنا ظلم کیوں کیا؟'' میں غصے میں بولتا جا رہا تھا۔

''بلبیر جی تمھاری بات ٹھیک ہے، لیکن یہ نہ بھولنا کہ حاکم اور محکوم میں ہمیشہ فرق رہا ہے اور رہے گا۔ حاکم اور طرح سوچتے ہیں اور رعایا کے سوچنے کا ڈھنگ اور ہوتا ہے۔'' ورما صاحب جذباتی ہو کر اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا رہے تھے۔

''تم میری بات نہیں سمجھ سکتے۔ یہ حملہ تمھارے اوپر نہیں، ہمارے اوپر ہوا ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ یہ حملہ کروایا ہی تم نے ہے — تمھارے الگ سوچنے کے ڈھنگ نے، تمھاری تنگ نظری نے، تمھاری خود غرضی نے۔'' میں وہاں سے چلا جانا چاہتا تھا۔

''بات سنو، بلبیر''، یہ آواز ورما صاحب کی تھی، ''سن اکاون میں جو مردم شماری ہوئی تھی، اس میں میں نے مادری زبان کونسی لکھوائی تھی؟ ملہوترہ صاحب نے کونسی لکھوائی تھی؟''

''بات تم دونوں کی نہیں، پنجاب کے ایک اچھے خاصے طبقے کی ہے۔ اتنے سال بیت جانے کے بعد بھی ان کے دلوں میں وہی کدورتیں ہیں، دلوں میں وہی بندشیں۔'' میں ان کو وہیں چھوڑ کے آگے چل پڑا۔

''ٹھہر جاؤ، ذرا'' ملہوترہ صاحب نے میرا بازو پکڑ لیا، ہم نے بھی تمھارے ساتھ جانا

ہے۔ سنگھ برادرز سے، ایک دو کتابیں لے کے چلتے ہیں۔''

وہاں سے دائیں ہاتھ مڑے تو سامنے سنگھ برادرز کی دکان تھی۔ اس وقت ستنام سنگھ اور گورساگر دونوں وہاں موجود تھے۔ ملہوترہ صاحب اور ورما صاحب چپ چاپ کرسیوں پر بیٹھ گئے لیکن میں کھڑا رہا۔ گورساگر نے میرے بیٹھنے کے لیے ایک اور کرسی منگوالی۔

''چائے لیں گے؟'' ستنام سنگھ نے پوچھا۔

''نہیں، کچھ نہیں''، میں نے جواب دیا۔

''انھیں کوئی ٹھنڈی چیز پلاؤ، بڑی گرمی میں ہیں آج۔'' ملہوترہ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کولڈ آجائے گی''، گورساگر نے حامی بھرتے ہوئے کہا۔

''اچھا، بات اس طرح ہے''، ملہوترہ صاحب نے گورساگر سے کہا۔ ''مجھے دو کتابیں چاہئیں۔''

''حکم کرو—''، گورساگر مسکرایا۔

''ایک تو بھائی کاہن سنگھ نابھہ والوں کا 'مہان کوش' دوسری 'دسم گرنتھ' ان کے علاوہ بھی کچھ کتابیں دکھاؤ۔'' ملہوترہ صاحب نے اشتیاق کے ساتھ کہا۔

''اور کس طرح کی کتابیں؟'' ستنام سنگھ نے اپنی دلچسپی ظاہر کی۔

''جن میں گوربانی کی تشریح کی گئی ہو۔ فرہنگ کو واضح کیا گیا ہو۔'' ملہوترہ صاحب نے بات کرتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے بھی کام لیا۔

''پھر تو آپ۔'' ستنام سنگھ نے مشورہ دیا، ''پروفیسر صاحب سنگھ کی شرح پڑھو۔''

''ٹھیک ہے، دکھاؤ''، ملہوترہ صاحب نے جواب دیا۔

''یہ دیکھنے والی چیز نہیں''، میں درمیان ہی میں بول پڑا، ''پڑھنے والی بات ہے، لیکن اس کے لیے بھی پھر آنا پڑے گا۔''

''پھر کیوں؟'' ملہوترہ صاحب کے ابرو تن گئے۔

''اس لیے کہ یہ کئی جلدوں میں ہے اور قیمت بھی کافی ہے۔ اگلی دفعہ پیسے لے کر

آئیں گے۔'' میں اب بھی تلخی میں تھا۔

''پیسوں کی کوئی بات نہیں''، گورساگر پھر مسکرایا'' یہ پھر بھی آ جائیں گے، پہلے کتابیں پسند کرو۔۔''

''ملہوترہ جی ـــ'' اب ورما صاحب بھی خاموش نہ رہ سکے، ''پسند نہ آنے والی کونسی بات ہے، میں دو سال خالصہ کالج میں پروفیسر صاحب سنگھ جی سے ڈیوینٹی (مذہبی تعلیم) پڑھتا رہا ہوں۔ میں تو ان کا بڑا قائل ہوں۔''

''ٹھیک ہے، پھر''، ملہوترہ صاحب نے فیصلہ کن انداز میں کہا'' یہ دو کتابیں اب آپ دے دیجیے، شرح ہم کل لے جائیں گے۔''

''بیشک ابھی لے جاؤ''، گورساگر نے مشورہ دیا، ''ہماری طرف سے کوئی انکار نہیں۔''

''کل ہم نے ادھر ماتھا ٹیکنے آنا تو ہے''، ملہوترہ صاحب نے وہ دونوں کتابیں اٹھاتے ہوئے کہا، ایک مرتبہ پھر آپ سے ملاقات ہو جائے گی۔''

دکان سے ہم نیچے اتر آئے۔ کچھ قدم چپ چاپ چلتے رہے۔ پھر بازار مائی سیواں ختم ہو گیا۔ آگے درشنی ڈیوڑھی، گورو بازار، تنگ بازار، چوک پاسی یاں، پھر کیسر کا ڈھاب اور مزید آگے ٹوبہ بھائی سالھو۔ وہاں ایک ہنگامہ تھا، ہلڑ بازی، دھینگا مشتی، گوردوارہ بھائی سالھو میں سے کچھ آدمی لنگر کی روٹیاں اٹھا لائے تھے۔ وہ روٹیاں انھوں نے پیپے والے کنوئیں کے چوک میں کتوؤں کے آگے پھینک دی تھیں۔ بڑے اُپکار کا کام ہوا تھا، سب کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر میں آگے بڑھا، ملہوترہ صاحب نے میرا بازو پکڑ لیا۔

''سکھڑا ـــ'' ایک طرف سے آواز آئی۔ '' پکڑ لو جوڑے سے''، کوئی اور بولا ''یہ کون ہے؟'' کسی نے بلند آواز میں پوچھا ''کیا پتا کون ہے ـــ کوئی اور بولا۔

''تمھیں نہیں پتا، یہ کون ہے؟'' ملہوترہ صاحب جیسے للکارے۔

''تم کیوں چپ کھڑے ہو؟'' ورما صاحب نے ایک آدمی کو گریباں سے پکڑ لیا۔

''میں نے کیا کہا ہے لا جی؟'' وہ آدمی گھبرا گیا۔

"یہی تو میں پوچھتا ہوں کہ تم کچھ کہتے کیوں نہیں؟" ورما صاحب بڑے طیش میں تھے، "تجھے نہیں پتا، شام لعل، کہ یہ کون ہے؟ بولتا کیوں نہیں؟"

"آپ تو لالہ جی یوں ہی گرمی کھائے جا رہے ہو"، وہ بندہ اپنے گلے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"ظہیر اور میں ہندو کالج میں چار سال پڑھتے رہے ہیں۔ ہم دونوں سیتلا مندر کی پاتھی گراؤنڈ والی شاکھا میں بھی جایا کرتے تھے۔"

"پھر —"، ملہوترہ صاحب نے میرے بازو کو اور زور سے پکڑ لیا، "پھر تم ان کا راستہ کیوں روک کر کھڑے ہوئے؟ سب کچھ جانتے ہوئے بھی تم ان پر طعنے کس رہے ہو، کس لیے؟"

"کوئی بات نہیں، ملہوترہ جی"، ایک ادھیڑ عمر شخص آگے آیا، "جاؤ آپ، ان کو کوئی کچھ نہیں کہے گا، میں دیکھتا ہوں ان کو کون ہاتھ لگاتا ہے۔"

"بات یہ نہیں"، ورما صاحب نے بازو کو جھٹکتے ہوئے کہا، "بات یہ ہے کہ تم نے انھیں اس لیے پریشان کیا کہ یہ سکھ ہے، انھوں نے بال رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے سر پر پگڑی ہے؟"

"چلو چھوڑو، اس بات کو جو ہوگیا سو ہوگیا"، بھیڑ میں سے کوئی اور بولا۔

"پھر یہ روٹیاں، لنگر کے یہ پرشادے —" ورما صاحب بولتے بولتے خاموش ہوگئے۔

"تمھیں نہیں پتا؟" ایک نیتا سا آگے آیا"، اس گوردوارے میں انتہاپسند رہتے ہیں — ہماری جان و مال کو خطرہ ہے۔"

"بات سنو —؟" ملہوترہ صاحب بولے، "اس گوردوارے میں سوائے بھائی صاحب (گوردوارے میں جو مذہبی کام انجام دیتا ہے) اور ان کے گھر کے افراد کے علاوہ اور کوئی نہیں رہتا۔ آج گوروپرب ہونے کی وجہ سے وہاں دیوان سجا تھا، لنگر تیار کیا گیا تھا اور آپ نے یہ کرتوت کی — تمھیں شرم آنی چاہیے۔"

''لیکن ان سکھوں نے کل ہمارے چوپڑہ صاحب کو گولی مار دی، ہم نے اس کا بدلہ تو لینا ہی تھا''، وہ پھر بھڑک اٹھا۔

''جس نے گولی ماری، اسے پکڑو''، ورما صاحب گرجے، ''یہ نہیں کہ بے گناہ لوگوں پر تم حملے کرو۔''

''جاؤ باؤ— ایسے ہی بڑبڑ نہ کرتے جاؤ''، ایک غنڈہ سینہ تان کے آگے آیا۔

''بات سن گھیدے تے'' مجھ سے رہا نہ گیا، ''وہ دن بھول گیا جب میں نے تجھے حمیدے کی جوتیوں سے بچایا تھا؟''

''کون سا حمیدا—؟'' وہ غنڈہ میری طرف لپکا۔

''وہی جس کے بھائی کو تم نے کچہری میں، پاکستان بننے کے کوئی سال پہلے چھرا گھونپا تھا''، میں نے اسے گریباں سے پکڑ لیا۔

''ہاں — مارا تھا، میرا کس نے کیا بگاڑ لیا''، گھیدے نے اپنی چھاتی پر زور سے ہاتھ مارا، ''اور آج بھی میں تمھارے کسی نزدیکی کو چھرا مار کر آیا ہوں۔ جا اسے جاکے دیکھ لے— چتر تھ کے گھر کے پاس وہی دودھی، اپنی سائیکل کے نیچے پڑا ہے۔''

ملہوترہ صاحب نے مجھے اپنی بغل میں لے لیا اور کھینچ کر دور لے گئے۔ ورما صاحب بھی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے ہمارے ساتھ شامل ہوئے۔ چوک سے ہم بیبے والے کنوئیں کی طرف ہو گئے۔ یہ وہی کنواں تھا جہاں سن چھیالیس میں مسلمانوں نے ایک سکھ لڑکے کو چھرے گھونپ گھونپ کر مار دیا تھا۔ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ روز کی طرح دربار صاحب ماتھا ٹیک کر گھر آ رہا تھا۔ اس وقت رات کے بمشکل نو بجے تھے۔ مسلمانوں کے ایک بھڑکے ہوئے جلوس نے اس کو گھیر لیا اور کچھ پوچھے بغیر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اب بھی اگر یہ دونوں دوست میرے ساتھ نہ ہوتے میرے ساتھ وہی ہوتا تھا۔ یہ بات سوچ کر میں اپنے دل میں ہنسا، وہ تو لڑکا تھا ابھی، لیکن میں کیا ہوں— باپ کا باپ، یا کچھ اور؟ یہ جواب میرے اردگرد کھڑے تھے، کہاں تھے یہ اس وقت؟ رحم میں یا شاید یہ ابھی اس کے بھی جز نہیں تھے بنے؟ کیا یہ سلمان رشدی کے 'مڈ نائٹس چلڈرن' تھے یا ان

کی اگلی اولاد؟

برگد والی گلی کے برگد کے نیچے میں کھڑا ہو گیا۔ ملہوترہ صاحب اپنی گلی میں جاتے جاتے رک گئے اور میرا بازو کھینچ کر کہنے لگے۔

''ابھی اپنے گھر جا کر کیا کرے گا؟ چلو اوپر، پہلے کھانا کھاتے ہیں، پھر میں تمھیں اپنی ایک نظم سناؤں گا۔''

مجھے تو اجازت دو، ملہوترہ جی'' ورما صاحب نے مصافحہ کرنے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا، ''میں تو یہ نظم کئی دفعہ سن چکا ہوں۔''

ملہوترہ صاحب نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور گلی کے گیٹ سے گزر کر اپنے مکان کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ اوپر جا کر ہم بیٹھک میں بیٹھ گئے، اسی بیٹھک میں جہاں بیٹھ کر ہم سالوں تک اردو ادب کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ ان سالوں کو بھی اب کئی سال ہو گئے تھے۔ کئی دہاکے گزر گئی تھیں —

میں بیٹھک کی کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔ وہاں سے ہماری گلی نظر آ رہی تھی۔ گلی کے سرے سے دو گھر پہلے وہ اونچا مکان کھڑا تھا جس کی چھت پر بیٹھ کر ہم رات کا پہرہ دیا کرتے تھے۔ یہ بات تقسیم کے دنوں کی تھی۔ اس وقت ہم کسی اور سے نہیں ڈرتے تھے، اب ہم ایک دوسرے سے ڈر رہے تھے۔ وقت گزر گیا تھا، کیا سچ مچ ہی وقت بیت گیا تھا؟ نہیں، وقت کبھی نہیں بیتتا، چکر کاٹتا رہتا ہے — بے مطلب چکر، اول جلول چکر۔

''بلبیر، کھانا تیار ہونے میں تھوڑی دیر لگے گی''، ملہوترہ صاحب نے رسوئی میں سے آتے ہوئے کہا، ''اتنی دیر آپ میری وہ نظم سن لیں۔''

''میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں نے یہ نظم سنی ہوئی ہے۔'' ورما صاحب نے دیوان پر لیٹتے ہوئے کہا ''میں اب یہ تکلیف برداشت نہیں کر سکتا۔''

''تو مت سنو''، ملہوترہ صاحب نے جواب دیا، ''تمھارے لیے چائے بن رہی ہے تم چسکیاں لیتے رہنا۔''

''ہم بھی پہلے چائے ہی پی لیتے، ملہوترہ صاحب۔'' میں نے ذرا چھیڑخانی کے موڈ

میں کہا۔

''نہیں ہم لسی پئیں گے۔ ہم تو پنجابی ہیں، گرم طبیعت والے۔ ورما صاحب کی بات اور ہے، یہ آدھا پنجابی ہے آدھا لکھنوی''، ملہوترہ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''یار، اب تو میں ایک پنجابن کے ساتھ شادی رچا کے پورا پنجابی بن گیا ہوں''، ورما صاحب پانسہ موڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔

''ٹھیک ہے، مان لی تمھاری بات — لیکن تم ابھی چائے ہی پیو۔'' ملہوترہ صاحب نے اپنی بیٹی کے ہاتھوں سے چائے کا پیالہ پکڑ کر اسے تھما دیا۔

''ہماری لسی بھی لے آؤ، آرتی''، میں نے اپنی فرمائش کی۔

ابھی لائی، انکل — ممی بنا رہی ہیں''، کہتی ہوئی وہ سیڑھیاں چڑھ گئی۔

''اچھا ظہیر، سن''، ملہوترہ صاحب نے اپنی کاپی کھول لی، ''یہ نظم میں نے گزشتہ ہفتے اپنے شہر کی بری حالت دیکھ کر لکھی ہے۔''

''پہلے کیوں نہیں لکھی؟'' میں ذرا دل لگی کے موڈ میں کہا ''اس شہر کی حالت تو بہت دیر سے کمزور ہے۔''

''تمھیں پتا ہی ہے، میں ممبئی سے پچیس سالوں کے بعد امرتسر آیا ہوں۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں اتنے عرصے ملک بدری کاٹ کر اپنے وطن لوٹا ہوں۔'' ملہوترہ صاحب تھوڑا جذباتی ہو گئے۔

''یہاں کے باشندے تو صرف ورما صاحب ہی ہیں''، میں نے اسے ذرا چڑایا،

''جو گزشتہ پانچ دہائیوں سے یہیں ٹکے ہوئے ہیں۔''

''یار، ہم کہیں جانے کے لائق جو نہیں''، ورما صاحب نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا، ''وکالت میری جان کی دشمن بن گئی ہے، نہ یہ مجھے چھوڑتی ہے، نہ میں اسے چھوڑ سکتا ہوں۔''

''ورما صاحب، یہ خالص پنجابی وصف ہے — ''تیری بانہہ نہیں چھوڑنی چاہے لگ جائیں ہتھکڑیاں، ٹھیک ہے نا، ملہوترہ صاحب؟'' میں ان کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''ٹھیک کیوں نہیں؟'' ملہوترہ صاحب ہنسے، ''یہ اپنی محبوب سرزمین کے ساتھ پوری طرح جڑ چکا ہے، ہمارا تو جوگی والا پھیرا ہے، ادھر سے آئے ادھر چلے گئے۔''

''پھر بھی ملہوترہ صاحب''، میں تھوڑا سنجیدہ ہوگیا، ''اس شہر کو ہم نے کبھی بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا، آنے بہانے اس کا ذکر کرتے رہے ہیں۔''

''بے شک، بے شک''، ملہوترہ صاحب نے آرتی سے لسی کے دونوں گلاس پکڑ لیے۔

''یہ الگ بات ہے''، میری سنجیدگی بڑھتی جا رہی تھی، ''کہ یہ نگری اب ہمیں پہچانتی نہیں۔''

''پہچانتی کیوں نہیں؟'' ملہوترہ صاحب نے ایک گھونٹ بھر کر اپنا لسی کا گلاس میز پر رکھ دیا، ''یہ نگری، گورو کی یہ نگری، ہمیں کبھی بھی نہیں بھولے گی۔''

سب خاموش ہوگئے۔ ورما صاحب نے چائے کا پیالہ اپنے پاس ہی فرش پر رکھ دیا۔ ملہوترہ صاحب کچھ دیر کاپی کے صفحات پلٹتے رہے۔ میں کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ باہر برگد کی ایک ٹہنی، ایک بڑی بھری ہوئی ٹہنی، نظر آ رہی تھی۔ لگاتار اس ٹہنی کے پتے ہل رہے تھے۔ لگاتار ان پتوں کی سرسراہٹ اور ہوا کی تال پر ناچ رہے یہ پتے۔ برگد کے یہ پتے، بالکل ننھے، بالکل معصوم، یہ کیا جانیں ہمارا حال؟ لیکن یہ برگد، یہ بابا برگد — اسے تو ہمارے سارے دکھوں کا پتا ہے۔

''لو سنو —'' ملہوترہ صاحب نے بلند آواز میں کہا، ''نظم کا عنوان ہے، 'شہر آشوب' یعنی برباد شہر کی داستاں —''

دل ہے امرتسر مرے پنجاب کا
ایک دنیائے حسیں ہے یہ نگر
خوں شہیدوں کا بہا ہے اس جگہ
جس نے کھولے بابِ آزادی کے در
کھا گئی کس کی نظر اس شہر کو

رشکِ جنت تھا کبھی میرا یہ گھر
یہ گرو نگری ہے مٹ سکتی نہیں
پورے بھارت کی ہے یہ نورِ نظر

ہم ابھی کھانا کھا ہی رہے تھے کہ شہر میں بلوہ ہوگیا۔ ہاتھی گیٹ کی طرف سے کچھ لوگ دوڑتے ہوئے آئے۔ شہر میں کرفیو نافذ ہوگیا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ چوپڑہ کی ارتھی کے ساتھ جا رہا ماتمی جلوس درگیانہ مندر والی شمشان بھومی کی جانب گیا تھا، اس نے جاتے ہوئے ہلڑبازی کی۔ چھتریوں پر سگریٹوں کی خالی ڈبیاں لٹکا کر نعرے لگائے۔ راستہ چلتے اکا دکا سکھوں کو پیٹا، ہال گیٹ اور ہاتھی گیٹ کے درمیان چترتھ کے گھر کے نزدیک، کچھ شرارتی عناصر نے ایک سکھ دودھی کو چھرے گھونپ گھونپ کے مار دیا۔ اس کا دودھ کا بھرا ہوا ولتوہا سڑک پر اوندھا پڑا تھا۔ دودھ چاروں طرف بکھرا ہوا تھا اور دودھی کی لاش سائیکل کے نیچے پڑی تھی۔ کسی نے بتایا کہ یہ دودھی بھبے والے کنوئیں کے دینے حلوائی کو ہر روز دودھ دینے کے لیے آتا تھا۔ اب بھی وہ ادھر ہی آ رہا تھا کہ شوالہ بھائیاں کی طرف سے آتے جلوس نے اسے اپنی نفرت کا نشانہ بنا لیا تھا۔ شاید گھسیدھا بھی اس جلوس میں شامل تھا۔ اسی لیے کچھ دیر پہلے بھبے والے کنوئیں والے چوک میں گپیں ہانک رہا تھا۔

جلدی ہی شہر میں کرفیو نافذ ہوگیا۔ جیپیں اور گھوڑسوار بازاروں میں گھومنے شروع ہوگئے۔ لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ ہم یہ سب اس مکان کی بازار کی طرف کھلتی کھڑکی میں کھڑے دیکھ رہے تھے۔ باقی کی معلومات ہمیں سامنے گھر والے ناتھی نے فراہم کی۔ وہ اپنی کھڑکی میں بڑا گھبرایا ہوا کھڑا تھا۔ اس کا بڑا لڑکا صبح ماتمی جلوس کے ساتھ گیا تھا لیکن ابھی تک گھر نہیں لوٹا تھا۔ اس کا چھوٹا لڑکا ابھی ابھی گھر پہنچا تھا۔ اس سے سنی ہوئی باتیں ناتھی ہمیں سنا رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہم بازار سے آئے تھے۔ اس وقت بھی صورت حال کشیدہ تھی۔

ناتھی تین سال میرے ساتھ پڑھا تھا۔ دو سال اسکول میں اور ایک سال کالج میں۔ کالج میں اس نے فرسٹ ایئر ہی پاس کیا۔ اس کے بعد اس کی شادی ہوگئی۔ وہ چاہتا تھا کہ ایف اے کرنے کے بعد ہی شادی کروائے لیکن اس کی بات کسی نے نہ سنی۔ اس کے گھر والے کہنے لگے کہ وہ پہلے شادی کرالے۔ بعد میں بے شک پڑھتا رہے۔ شادی کے بعد وہ کچھ دن کالج جاتا رہا لیکن پڑھائی میں اس کا دل نہ لگا۔ کئی مرتبہ ہم اسے رات نو دس بجے گول باغ کی طرف سے آتا دیکھتے۔ اس کے ساتھ اس کے دو تین بے کار ساتھی بھی ہوتے۔ پان چباتے ہوئے اور سگریٹوں کے دھوئیں چھوڑتے ہوئے وہ ادھر سے آتے ہمیں ملتے۔ میرے پاس سے گزرتا ہوا ناتھی ہمیشہ نظریں چرا لیتا۔ جلدی ہی وہ اپنے سسر کے اثر و رسوخ کے ساتھ پنجاب نیشنل بینک میں نوکری لینے میں کامیاب ہوگیا۔ آہستہ آہستہ اس کی زندگی ہموار ہونے لگی۔ دو سال بعد اس کے گھر لڑکا پیدا ہوا۔ انھی دنوں میں بی اے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔

ایک مدت کے بعد وہ میرے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اس کے سر کے بال سفید ہوچکے تھے۔ دھاریوں والے پاجامہ میں وہ ملبوس تھا اور اوپر بنیان پہنی ہوئی تھی۔ بنیان تھوڑی اونچی ہونے کی وجہ سے اس کی گہری ناف نظر آرہی تھی۔ باتیں کرتے ہوئے وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''تم بلبیر، یہاں کیسے؟''

''کیوں—؟''

''نہیں، بڑے عرصے بعد نظر آئے ہو، اس لیے پوچھا ہے۔''

''کسی کام آیا تھا، شاید کل چلا جاؤں۔''

''کل کیسے چلا جائے گا، کرفیو تو غیر معین عرصہ کے لیے لگا ہے۔''

''کل نہیں تو پرسوں۔ اچھا بات سن، میں تمھارے کوٹھے کے پیچھے سے سرداری کے کوٹھے پر کود جاؤں؟ وہاں سے میں اپنے گھر چلا جاؤں گا۔''

''آ جاؤ، بلبیر، یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے؟ تمھاری گلی کے آگے تو لوگوں کی

بہت بھیڑ لگی ہوئی ہے۔"

"بھیڑ نے مجھے کیا کہنا ہے، لیکن ویسے ہی اتنے آدمیوں میں سے گزر کر جانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ویسے بھی ان میں مجھے اپنی گلی کا کوئی شخص نظر نہیں آتا۔"

"ناتھی، یہ لوگ کوئی نہ کوئی شرارت ضرور کریں گے، نہیں تو یونہی اکٹھے ہونے کا کیا مطلب۔"

تمھاری گلی میں تو سکھوں کے دو ہی گھر ہیں، ایک تمھارا، دوسرے تمھارے تایا جی کا — ذرا خبردار رہنا۔"

"وہ بھی آج جالندھر گئے ہوئے ہیں، بس میں ہی یہاں سوالاکھ ہوں۔"

"فکر نہ کرو بلبیر، ہم ابھی زندہ ہیں تمھارا کوئی بال بیکا نہیں کرسکتا۔"

ملہوترہ اور ورما مجھے روکتے رہے لیکن میں نے ان کی ایک نہ سنی۔ کسی نہ کسی طرح میں اپنے گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ گزشتہ دو دنوں سے میں بہت پریشان تھا۔ پتا نہیں لگ رہا تھا کہ کیا ہو رہا تھا۔ جن باتوں کا ہم مذاق اڑاتے آرہے تھے، وہ سچ ثابت ہو رہی تھیں۔ جب کوئی کہتا، 'ہندو سکھ اتحاد زندہ باد' تو ہماری ہنسی نکل جاتی۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی؟ جو بات ہی واضح ہے، اس کے متعلق نعرے لگانے کا کیا مطلب؟ حد ہوگئی ان بدخواہوں کی، جان بوجھ کر دو فرقوں میں دوئی کا احساس پیدا کر رہے ہیں۔ ایک ہی پیڑ کی دو شاخیں، اسی طرح اتفاق و اتحاد کا نعرہ مارنے والے جان بوجھ کر اصل مسائل سے لوگوں کا دھیان ہٹا کر دوسری طرف لگا رہے ہیں تاکہ وہ اپنا الو سیدھا کرتے رہیں۔

اچانک میرے دل میں خوف سا ابھرا۔ میرے دل کے شیشہ میں ایک بال سا پیدا ہوا۔ کبھی ہم ترقی پسند ادیب، ہندوؤں اور مسلمانوں میں بھی کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ فرق کیسا اور کس لیے؟ لیکن آہستہ آہستہ زہر گھلنے لگا، گھلتا رہا، گھلتا گیا، دو ٹکڑے، دو قومیں، دو ملک۔ اب آئندہ کیا ہونا باقی تھا؟ اسکول میں پڑھتے ہوئے تاریخ کا استاد جب کہتا کہ مسلمانوں نے ہندوؤں، خاص کر کے سکھوں پر بہت ظلم ڈھائے، بہت اذیتیں پہنچائیں تو ہمارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے، ہمارے دل میں مسلمانوں کے تئیں نفرت بیدار ہوتی، انتقامی

جذبہ پیدا ہوتا۔ پھر یہ نفرت آہستہ آہستہ زہر کی شکل اختیار کر لیتی۔ ہماری رگوں میں خون کی بجائے زہر دوڑنے لگتا۔ پھر جب ہم کالج میں گئے، وہاں بھی تاریخ پڑھی۔ کچھ اور ہوش سنبھالا، دوسرے ممالک کی سیاسی تحریکوں کے بارے میں واقفیت حاصل ہوئی۔ انسانیت پر ہونے والے مظالم میں ایک یکسانیت سی دکھائی دی۔ ایک فرقہ، ایک اور فرقہ، فرقوں کے مابین کشیدگی۔ لڑائی قبایلیوں کی آپس میں، زمیندار اور کارندوں کی محنت اور سرمائے کی، شرافت اور بدنیتی کی، نیکی اور بدی کی، حکمرانوں اور محکوموں کی، ملکی اور غیرملکیوں کی — گھوم پھر کر، بار بار، لگاتار۔

یہ سب کچھ ٹھیک تھا اور بھی بہت کچھ ٹھیک تھا۔ بات بہت دیر کے بعد سمجھ میں آئی کہ لڑائی نہ ہندو میں تھی، نہ مسلمان میں، لڑائی تو تھی حکومت کے جوش اور عوام کی غیرت کی۔ حکومت جب خودغرض بن جائے، یہ جلد ہی لعنت بن جاتی ہے، پھر یہ لوگوں پر اپنی دھونس جمانے کے بہانے ڈھونڈتی ہے۔ اس وقت اسے اپنے بیگانے میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ خودغرضی ہی اس کا اولین مقصد ہوتا ہے۔ خودغرضی کی جے — ! اتنی دیر تک سب کچھ ٹھیک رہتا ہے جتنی دیر کسی کو اس کی چالیں سمجھ میں نہیں آتیں، بعد میں — ایک قہر، ایک کربلا، ایک نیلا تارا۔

ملہوترہ صاحب کے گھر سے نیچے اتر کر میں برگدوالی گلی کے گیٹ کے پاس آکھڑا ہوا۔ دائیں طرف، ہماری گلی کے باہر، بھیڑ اور بھی بڑھ گئی تھی۔ بائیں طرف سارے بازار میں لوگ ٹولیوں کی شکل میں کھڑے تھے۔ عورتیں اور بچے اپنے اپنے مکانوں کے چھجوں پر جھکے ہوئے کھڑے تھے۔ سب کی نظروں سے بچتا بچاتا میں ناتھی کے مکان کا چبوترہ چڑھ گیا۔ اندر ڈیوڑھی میں اس کا چھوٹا لڑکا اسکوٹر کا پلگ صاف کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر گھبرا گیا، میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اوپر سیڑھیوں کے پاس سے ناتھی نے آواز دی۔

''اوپر آجاؤ ظہیر۔''

''آرہا ہوں — تمھاری یہ سیڑھیاں پتا نہیں کب کی بنی ہوئی ہیں۔''

''اس وقت کی جب سے مکان بنا ہوا ہے۔''

''ماں کی تمھاری بات لیکن انھیں ٹھیک تو کروا دو، پاؤں اوپر رکھو، جاتا نیچے کو ہے۔''
''تو آج آیا ہے، پتا نہیں چالیس سال بعد، آتے ہی نقص نکالنے لگ پڑا ہے۔''
''نہیں چالیس تو نہیں ہوئے ابھی۔ پاکستان بننے تک تو ہم ان سیڑھیوں پر دگڑ دگڑ کرتے ہوئے چڑھتے اترتے رہے ہیں۔''
''اس وقت کی ہی بلی ہوئی ہیں، تیرے بڑے بڑے بوٹوں سے اچھا، یہ بتا، اب بھی تیرے پاؤں کے میل کا بوٹ مل جاتا ہے کہ بنوانا پڑتا ہے؟''
''نہیں—''
''بات سیدھی ہے، اگر مل جائے تو بنوانے کی ضرورت نہیں، اگر نہ ملے تو پاؤں کا ناپ دے کے بنوالو۔''
''تم نے بڑے پتے کی بات کہی ہے، اس لیے یہ مجھے کیسے سمجھ آسکتی تھی۔''
ایک قہقہہ سا لگاتے ہوئے ہم نے ایک دوسرے کے ہاتھ پہ ہاتھ مارا، میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں زور سے پکڑ کر وہ مجھے اپنی بیٹھک میں لے گیا۔ ہمیں اندر آتے دیکھ کر اس کی بیوی مونڈھے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اسی طرح کی ہی تھی جس طرح کی ہم اس وقت دیکھتے ہوتے تھے۔ بس، جسم تھوڑا سا بھاری ہوگیا تھا، چہرہ مہرہ ویسے کا ویسے تھا۔ اتنا ضرور تھا کہ کنپٹی کے پاس اس کے سر کے بال سفید ہوگئے تھے۔ ناتھی کے دونوں لڑکوں اور بڑی بیٹی کی شادی ہوچکی تھی۔ چھوٹی کی ابھی شادی کرنی تھی۔ ناتھی کی بیوی نے اپنی بڑی بہو سے میرے لیے کچھ لانے کے لیے کہا لیکن میں نے انکار کردیا۔ پھر بھی وہ پلیٹ میں کچھ پھل رکھ کر لے آئی۔ اس گھر میں نوجوان نسل کو دیکھ کر میرے دل میں خیال آیا کہ یہ بچے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔ ہمارے پروان چڑھتے وقت ہندوؤں اور مسلمانوں میں فساد ہوتے رہے۔ ان کے کھیلنے کودنے کے جب دن آئے تو ہندوؤں اور سکھوں میں کھینچا تانی شروع ہوگئی۔ اتنے میں ناتھی کی چھوٹی لڑکی اوپر سے اتر کر نیچے ہمارے پاس آگئی۔ وہ بی اے کے سال آخر میں پڑھ رہی تھی۔ وہ نہایت خوبصورت اور بڑی ملنسار تھی۔

''نیلم، تیرے انکل لدھیانہ گورنمنٹ کالج میں انگریزی کے پروفیسر ہیں۔'' ناتھی نے اس کے ساتھ میرا تعارف کروایا۔

''انکل، آپ امرتسر چھوڑ کر لدھیانہ کیوں چلے گئے؟'' نیلم نے غیرارادی طور پر مجھے پوچھا۔

''اس لیے کہ یہاں میرا دم گھٹتا تھا۔ بند ماحول، بند دماغ، بند گلیاں، بند مکان، بند کمرے''، میں شاید ضرورت سے زیادہ بول گیا تھا۔

''یہ سب کچھ تو انکل ہر جگہ ایک جیسا ہے — یہاں کوئی زیادہ تو نہیں''، نیلم نے آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا۔

''اسی لیے تو میں شہر شہر بھٹکتا رہا ہوں — میرے دل کو سکون تو کہیں بھی نہیں ملا''، میں نے اپنے دل کی بات اس کے ساتھ ساجھی کرلی۔

''اب تو تمھارا دل ستلج سے پار لگ گیا ہے''، ناتھی دوران گفتگو بول پڑا۔

''ویسے ہی جیسے مسافروں کو جہاں شام ہوجائے، وہیں ڈیرا ڈال دیتا ہے''، میں نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کی۔

''شاعر کو ہر جگہ پر شاعری سوجھ جاتی ہے''، ناتھی نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

''تم یہ بات سوچ بھی نہیں سکتے، ناتھی، کہ اس شہر سے جاتے وقت مجھے اتنا ہی دکھ ہوتا تھا، جتنا کہ اس شہر میں رہنے کی وجہ سے''، پتا نہیں کیوں میرے منھ میں سے یہ بات نکل گئی۔

''ویسے بھراجی (بھائی صاحب)''، ناتھی کی بیوی نے ہماری باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا ''مجھے تو یہ شہر بہت پسند ہے، میرا تو اور کہیں دل نہیں لگتا۔''

''یہی حال میرا ہے بھابی جی''، میری آواز کچھ بھاری ہوگئی، ''جاتے ہوئے میں یہاں سے دوڑتا ہوا جاتا تھا اور آتے ہوئے دوڑتا ہوا آتا تھا۔''

''پھر تو انکل، آپ اپنے آپ ہی سے دوڑ رہے تھے''، نیلم زیادہ دیر چپ نہ رہ سکی۔

''نیلم بیٹی، تمھاری بات کا جواب میرے پاس نہیں۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ جو چیز مجھے

حاصل نہیں تھی، اس سے میں بیگانہ ہوگیا تھا''، میں نے جیسے اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش کی۔

''پھر بھی انکل، آپ نے بہت کچھ حاصل کرلیا ہے''، نیلم نے جیسے مجھے ڈھارس دی۔

''وہ کیسے ۔۔۔؟'' میں نے تعجب کے ساتھ پوچھا۔

''آپ کا ناول 'اک ہورنواں سال' (ایک اور نیا سال) میں نے دسویں میں پڑھا تھا، یہ ناول مجھے بہت پسند ہے''، نیلم میرے لیے معمہ بنتی جارہی تھی۔

''تجھے کس نے بتایا ہے کہ یہ ناول میرا لکھا ہوا ہے؟'' میں نے اشتیاق کے ساتھ پوچھا۔

''سامنے گھر والے ملہوترہ انکل نے مجھے اس وقت ہی بتا دیا تھا''، نیلم نے کھڑکی میں سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن، نیلم تجھے کس نے بتایا ہے کہ وہ میں ہی ہوں؟'' حیرانی کے ساتھ میں نے اسے پوچھا۔

''یار، تم مجھے بھول گئے۔'' ناتھی کی آواز ابھری، ''کیا میں اسے نہیں بتا سکتا کہ وہ جو اونچا لمبا، ٹیڑھا میڑھا، تیکھی مونچھوں والا، لمبے لمبے ڈگ بھرتا جارہا ہے وہ شخص ہمارا پرانا دوست ہے۔''

''تم سے مجھے یہ امید نہیں تھی کہ تم میرے بارے میں اس طرح کہے اور اپنی توند کو چھپا کر رکھے۔'' میں نے اس پر ذرا چوٹ کی۔

''توند تو بیٹھنے والے شخص کے بڑھ ہی جاتی ہے''، ناتھی نے اپنی بنیان توند کے نیچے تک کھینچنے کی کوشش کی۔

''اس طرح ہی بلند عزائم رکھنے والے کا قد لمبا ہو ہی جاتا ہے''، میں نے بات کا رخ بدلا۔

یہ بات سن کر سب ہنسنے لگے۔ اتنے میں ناتھی کا بڑا لڑکا سیڑھیاں چڑھ آیا۔ ماحول

خوشگوار ہو گیا۔ میں بھول ہی گیا کہ میں کسی اجنبی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ انھیں میں ایک طرح سے پہلی مرتبہ ہی مل رہا تھا، لیکن یوں تھا جیسے عرصہ سے ایک دوسرے سے آشنا ہوں۔

''میں ابھی چائے بنا کر لائی''، یہ بات کہتی ہوئی نیلم اوپر سیڑھیاں چڑھ گئی۔

تھوڑی دیر اور اس طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر میں تائی کے ساتھ ان کے کوٹھے پر چلا گیا۔ اب کے گھر کی پیٹھ سرداری کے مکان کے ساتھ لگتی تھی۔ ان دونوں گھروں کے مکانوں کے درمیان ایک تھوڑی سی اونچی دیوار تھی۔ اس وقت تو ہم بہت آسانی کے ساتھ اس دیوار کو پھلانگ جاتے تھے، لیکن اب یہ کام بہت مشکل نظر آتا تھا۔ اب ایک طرف کے جھرنوں میں انگلیاں پھنسا کر اور پاؤں کو کسی ابھری اینٹ یا کپڑے سکھانے والی رسی کے کیل پر ٹکا کر کوشش کی جاسکتی تھی۔ شاید میں یوں کر ہی لیتا لیکن مجھے یہ بات اچھی نہیں لگ رہی تھی کہ چوروں کی مانند ایک گھر سے دیوار پھلانگ کر دوسرے گھر میں جاؤں، پھر سرداری کے مکان سے تین منزلیں اتر کر نیچے ڈیوڑھی میں جانا، ڈیوڑھی سے گلی میں، گلی میں سے گزر کر اپنے گھر۔ یہ سارا کام مجھے واجب نہیں لگ رہا تھا۔ ہوسکتا تھا کہ اس طرح سیڑھیاں اترتے ہوئے مجھے ان کے گھر کا کوئی ایسا فرد دیکھ لے جو مجھے نہ جانتا ہو، تو اس نے تو ڈر کر شور مچا دینا تھا۔ سرداری کی ماں مر چکی تھی۔ اس کی بڑی بھابی ہی مجھے جانتی تھی۔ اور تو کوئی نہیں جانتا تھا۔ سرداری آپ خود دن میں گھر بیٹھنے والا نہیں تھا۔ ویسے بھی اپنی گلی میں سیدھے راستے سے آنے کی بجائے اس ڈھنگ کے ساتھ آنا میری خودداری پر بہت بڑی چوٹ تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ فسادات کے دنوں میں اس کے برعکس واقع ہوا تھا۔ ہم سبھی افراد اپنے گھر کے کوٹھے سے پچھلے گھر کے کوٹھے پر پھلانگ گئے تھے۔ وہاں سے نیچے اتر کر بازار میں دونوں اطراف جھانک کر، ہم بالکل سامنے پڑتی برگد والی گلی میں چلے گئے تھے۔ اس وقت اپنی گلی میں رہنا خطرے والی بات تھی اور سوائے مردوں کے تاکہ گھروں کی حفاظت ہوسکے، باقی سب کو گلی میں سے چلے جانے کا مشورہ دیا گیا تھا۔

ذہنی کشمکش میں پڑے مجھے اپنے آپ پر شرم بھی آئی اور غصہ بھی۔ یہ بات اس وقت

تو ٹھیک تھی۔ جب مسلمانوں کا بلوہ ہوتا تھا یا کرفیو لگا ہوتا تھا۔ کرفیو تو اب لگا ہوا تھا لیکن بازار میں روزانہ کی طرح گھوم پھر رہے تھے۔ اس وقت بلوچی سپاہی کرفیو کی خلاف ورزی کرنے والے کو گولی مار دیتے تھے۔ اب تو بات ہی کچھ اور تھی۔ اپنے لوگ، اپنے سپاہی، یہ سپاہی خواہ سی آر پی ایف کے ہوں یا بی ایس ایف کے ہماری حفاظت کے لیے تھے، ہمیں مارنے کے لیے نہیں۔ یہ بھی تو اپنے تھے، ہمارے محافظ ہم میں سے ہمارے لیے۔ ان سے کیسا ڈرنا؟ ابھی گزشتہ سال ہی تو انھوں نے اس شہر کے لوگوں کو بہت بڑے سانحہ سے نجات دلائی تھی۔ اس وقت ہم نے انھیں پوریاں کھلا کر یا ان میں لڈو یا برفی تقسیم کر کے ان کی تھوڑی بہت خدمت کی تھی۔ تب سے ان کے ساتھ ہمارا پیار بڑھ گیا تھا۔

''نہیں بھائی ناتھی — یہ بات ٹھیک نہیں۔ یوں کوٹھا پھلانگ کر دوسرے کے گھر جانا بزدلی ہے اور میں بزدل ہوتے ہوئے بھی بزدل ثابت نہیں ہونا چاہتا۔'' میں نے اپنے ہاتھوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑتے ہوئے اسے کہا۔

''کیوں ایسے ہی سوچ میں پڑ گئے ہیری؟ میں یہ چارپائی دیوار کے ساتھ کھڑی کر دیتا ہوں۔ تم بان میں پیر پھنسا کر اوپر چڑھ جاؤ، وہ دن بھول گیا، جب ہم ان منڈیروں پر چڑھ کر پتنگ اڑایا کرتے تھے، ڈور لوٹا کرتے تھے، ادھر ادھر جھانکا کرتے تھے''، ناتھی مجھے حوصلہ دے رہا تھا۔

''تجھے جھانکنے کی بہت عادت تھی مجھے نہیں۔ یاد ہے نا جب ستیش کی بھابی نے تجھے گالیاں دی تھیں''، میں نے اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔

''تجھے تو پتا ہی ہے، اس کی سردیوں میں اوپری کوٹھے پر منڈیر کے پاس نہانے کی عادت تھی۔ نہاتے ہوئے وہ چاروں طرف دیکھتی رہتی تھی۔ ایک بار میری شامت آ گئی''، ناتھی باتیں کرتا کرتا نظریں چرا گیا۔

''اس کے بعد تو سدھر بھی گیا تھا''، میں نے بات ختم کرنے کے انداز میں کہا۔

''ہاں — پھر میں کبھی بھی منڈیر پر نہیں چڑھا تھا، بلکہ جھرنے کو تھوڑا سا توڑ دیا تھا''، ناتھی کھل کر ہنسا۔

ہنستے ہنستے ہوئے میں ان کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ تیسری چھت سے دوسری چھت، دوسری سے پہلی اور پھر ڈیوڑھی۔ گھر کا چبوترہ، دو سیڑھیاں چبوترے کی، سڑک پر میرا دایاں پاؤں، ایک قدم، دو قدم، تیز اور تیز، گلی کا لوہے کا دروازہ، اس کی درمیانی کھڑکی میں پہلے ایک پاؤں اندر کو، پھر سر اور ساتھ ہی دھڑ کے ہچکولے کے ساتھ دوسرا پاؤں بھی گلی میں۔ گلی کے باہر بہت بھیڑ تھی۔ اجنبی چہرے، گھور رہی آنکھیں، بند مٹھیاں، یہ لوگ، یہ سب لوگ ہمیشہ سے اس طرح ہی تھے۔ اسی انداز کے ساتھ، اسی غلط فہمی میں، اسی جوش و خروش کے صدقے مصروف کار تھے۔ صدیوں سے سولی، زہر، خنجر، تلوار، گرج، ترشول، جے کارے — جے جے کارے۔ ایک فتح کا احساس، ایک جیت کا گمان۔ وقت کی دھول، گہری اور گہری۔ پھر اس میں سے ابھرتی ہیں شکلیں، کئی شکلیں۔ وہ سب شکلیں اب میرے سامنے تھیں۔ گھور رہی آنکھیں، پہچان رہی آنکھیں، پہچاننے سے انکار کر رہی آنکھیں، کہاں تھیں وہ آنکھیں جو پہچان سکتیں؟ اپنے پاس بلا سکتیں؟ پیار کا پیغام دے سکتیں؟ ان بے شمار آنکھوں سے بچتا بچاتا میں گلی کے گیٹ سے تو گزر آیا، لیکن آگے پھر اسی طرح کی آنکھیں تھیں، گلی کے چبوتروں پر، مکانوں کی کھڑکیوں میں، ایک ہی ڈگ، ایک جست میں، گلی کے موڑ سے آگے اور آگے، کنوئیں کے سامنے کوڑے کا ڈھیر، نالی میں سے اٹھ رہی بدبو، ہمارے چبوترے کے پاس پاخانہ کر رہا بچہ، ایک اور بچے کے پاخانے والے کپڑے کے ٹکڑے کو کھڑکی میں سے نیچے پھینک رہی ایک عورت۔ جلدی سے میں نے اپنے چبوترے کی دو سیڑھیاں چڑھیں، میرا دم گھٹ رہا تھا، ہوڑے کی چابی، کبھی دائیں کبھی بائیں، دروازہ جب کھلا تو یوں لگا جیسے جان میں جان آ گئی۔

5

دروازہ کھولنے کے بعد اندر داخل ہوتے ہی پہلا کام دروازہ بند کرنے کا تھا۔ اندر سے ہوڑہ لگایا، ارل لگائی، چٹخنی لگائی۔ پھر بھی درازوں سے دیکھا، کوئی باہر تو نہیں کھڑا، کوئی پیچھے سے تو نہیں آ گیا۔ ایک لمبی سانس لی۔ کبھی ہم سب ایک دوسرے کا ساتھ دینے کے لیے اپنے گھروں سے دوڑتے ہوئے گلی میں آتے تھے۔ آج مجھے اپنے گھر میں دوسروں سے بچنے کے لیے داخل ہونا پڑا تھا۔ میں بے خیالی ہی میں صحن سے گزر گیا۔ پچھلے کمرے کا دروازہ کھولا، بتی جلائی، پھر میں پلنگ پر دونوں ٹانگیں نیچے لٹکا کر بیٹھ گیا۔ آہستہ آہستہ میری سانس ٹھیک ہوئی۔ اس وقت میرے دل کی عجیب کیفیت تھی جیسے میں اپنے ہی گھر میں چوری کرتا ہوا پکڑ لیا گیا ہوں۔ اب مجھے اپنا گھر بھی اپنا گھر نہیں لگ رہا تھا۔ میں اپنے آپ کا کیا کروں، جس کے احساس میں اس گلی کی بو بس چکی تھی؟ میں اپنے آپ کو کہاں لے جاؤں، جس کا بچپن اور لڑکپن اس گلی کے تانے بانے میں الجھا ہوا تھا؟

یہ وہی گلی تھی جس کی نالیوں سے برانٹے (کانچ کی گولیاں) نکالنے کے لیے میں نے ہزار بار ہاتھ ڈالا تھا۔ یہ وہی گلی تھی جس میں آنکھ مچولی کھیلنے کے بہانے لڑکیاں لڑکے کتنی کتنی دیر تنگ سیڑھیوں اور اندھیری ڈیوڑھیوں میں چھپے رہے تھے۔ یہ وہی گلی تھی جس سے، ذرا بڑا ہونے پر، گزرتے ہوئے میں چبوتروں پر بیٹھی عورتوں کو دیکھ کر نظریں نیچی کر لیتا تھا۔ اس ڈر کے ساتھ کہ کہیں کوئی عورت، یا کسی لڑکی کی ماں، میرے بھائی جی کو یہ نہ کہہ دے کہ تمھارے لڑکے کی آنکھوں میں شرم و حیا ہی نہیں۔ پھر یہی گلی تھی وہ جس میں سے میں گھوڑی کے اوپر بیٹھ کر بارات لے کر گزرا تھا۔ اگلے دن شام ڈھلے ڈولی بھی اسی گلی میں آئی تھی۔ یہ وہی گلی تھی جہاں سے میں دوڑ گیا تھا اور پہاڑوں پر سالوں تک رہا

تھا، لیکن سردیوں میں جوگی والا پھیرا ڈالنے ضرور آتا تھا۔ ہاں، ہاں، یہ وہی گلی تھی، جس میں سے میری ماں کی ارتھی نکلی تھی۔ مدتوں پہلے وہ بھی اسی گلی میں بیاہی آئی تھی۔ انھوں نے ساری عمر اس گلی کے لیے وقف کردی تھی۔ لیکن اب مجھے اس گلی سے ڈر لگ رہا تھا۔ زمین کا یہ ٹکڑا، یہ چھوٹا سا ٹکڑا اگر میرا نہیں تو پھر یہ زمین، یہ سنسار، یہ کائنات کس کے لیے ہے، کن کے لیے ہے؟

مجھے یہ باتیں سوچتے ہوئے کچھ الجھن، بے قراری اور گھبراہٹ سی ہوئی۔ کمرے میں سے باہر آکر میں اوپری چھت پر چلا گیا۔ بیٹھک کی کھڑکی کھلی تھی، اندر کبوتروں نے بیٹھیں کی ہوئی تھیں۔ کارنس پر بیٹھے دو کبوتر غٹرغوں غٹرغوں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اڑ گئے۔ میں کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ سامنے گھر کی کھڑکی میں چندرانی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی گود میں اس کا سال سوا سال کا پوتا تھا۔ اس کی شادی اسی دن ہوئی تھی جس دن میرے بڑے چچا کی ہوئی تھی۔ اس کے خاوند کو تو ہم اتنا خاطر میں نہیں لاتے تھے لیکن اسے بڑے ادب کے ساتھ چچی کہا کرتے تھے۔ اس وقت میں ساتویں آٹھویں میں پڑھا کرتا تھا۔ شادی کے بعد چندرانی کی خوبصورتی کی دھاک ساری گلی میں بیٹھ گئی۔ اس کے گھر کے سامنے، تھوڑے فاصلے پر، کنوئیں پر نہانے آئے لڑکے کتنی کتنی دیر تک پہلے اپنے جسم پر کڑوے تیل کی مالش کرتے، پھر ڈنڈ بیٹھکیں لگاتے، پھر ایک لڑکا، بڑی سریلی آواز میں فلمی گیت چھیڑ دیتا 'ساون کے بادلو ان سے یہ جا کہو' کبھی کبھی چندرانی اپنی کھڑکی میں آکر کھڑی ہوجاتی اور کتنی کتنی دیر اپنے بالوں میں کنگھی کرتی رہتی۔ یا پھر وہ اپنے سینہ کو کھڑکی کے اوپر والے ڈنڈے پر رکھ کر، گلی میں سے گزر رہے کسی چھابڑی والے کو آواز دیتی۔ ''ارے بھائی ٹھہر جاؤ، نیچے اتر کر وہ چبوترے پر اکڑوں بیٹھ کر سبزی چھانٹنے لگ جاتی یا پھلوں کو تلوانے لگ جاتی۔ اتنے میں کنوئیں پر نہا رہا وہ لڑکا اپنی سریلی آواز تھوڑی اونچی کر دیتا — ''اے چاند چھپ نہ جانا جب تک میں گیت گاؤں۔''

وہی چندرانی اب ہماری کھڑکی کے سامنے اپنے پوتے کو گود میں لے کر بیٹھی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے دھیان میں بچے کو تھپتھپا رہی تھی۔ اس کے ساتھ

بات کرتے وقت مجھے ہمیشہ کچھ جھجک سی محسوس ہوتی تھی۔ اب بھی میں ذہنی کشمکش میں ہی تھا کہ اس کی نظر مجھ پہ پڑ گئی۔ بچے کو بیڈ پر لٹا کر وہ کھڑکی میں آ گئی۔ پہلے وہ اپنے خاص انداز میں کھڑکی کے اوپر والے ڈنڈے کے اوپر جھکی اور پھر مجھے پوچھنے لگی —

''کب آیا بیری؟''

''کل شام —''

''سب بال بچے ٹھیک ہیں؟''

''ہاں، بالکل ٹھیک —''

''باؤ جی —؟''

''وہ بھی ٹھیک ہیں، آج کل گورداس پور گئے ہوئے ہیں۔''

''چلو جہاں بھی رہیں، سلامت رہیں۔''

''میں تو بلکہ یہاں آ کر پچھتا رہا ہوں۔''

''کیوں — کیا بات ہوئی؟''

''یہ جو شور وغل ہے — جلوس، نعرے، بلڑ بازی۔''

''اب یاد ہے وہ دن جب پاکستان بنا تھا؟ کتنے فساد ہوئے تھے، نہ دن کو آرام، نہ رات کو چین، کئی کئی دن کرفیو لگا رہتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے دودھ کے لیے بلکتے رہتے تھے۔''

''لیکن بیجی، دودھ تو میں آپ کی چھوٹی بہن کے گھر ساتھ والی گلی میں پہنچا آتا تھا۔''

''ہاں، بیری — تمہارے بھائیا جی بڑی اچھی عادت کے تھے، اپنے گائے اور بھینس کا دودھ ملکھی کے ہاتھ چھوٹے چھوٹے بچوں والے گھروں میں بھجوا دیتے تھے۔''

''لیکن سُلکھنا کے گھر تو میں ہی کوٹھے پھلانگ پھلانگ کر جایا کرتا تھا۔''

''اُس کے گھر اس وقت پہلا بچہ ہوا تھا اور وہ بھی بہت گھبراتی تھی — بہن میں کیا کروں، میرے دودھ کے ساتھ تو اس کی تشفی نہیں ہوتی، میں اسے دودھ بھجوانے کا دلاسہ

دیا کرتی تھی۔''

''ویسے چچی، ان کے گھر کے سامنے جو گھر تھا وہ بھی لویرے (دودھ دینے والا مویشی) والا تھا، لیکن وہ کسی اور کو بغیر پیسوں کے اپنے گھر سے دودھ نہیں دیتے تھے۔''

''مجھے معلوم ہے، وہ لوگ بڑے بیہودہ اور خشک طبیعت کے تھے۔''

''ایک بار ان کا بیٹا مجھے کہنے لگا — دودھ دینے بڑی دور سے آتا ہے، اچھے دام فروخت کرتا ہوگا؟'' میں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا لیکن خاموش رہا۔ میری پیٹھ پیچھے ہی وہ بڑبڑایا — 'یہ بکھڑ اوروں کا بھی حق مار رہا ہے' پہلے تو میرے دل میں آیا کہ ایک طمانچہ اس کے منھ پر رسید کروں۔ پھر پتا نہیں کیا سوچ کر میں گھر لوٹ آیا۔

''چلو چھوڑو پرانی باتیں، بیری، اس دنیا میں کئی طرح کے بندے ہیں۔''

''چچی، اب بھی کونسی کم ہو رہی ہے۔''

''بیری، اب تو بلکہ اگلی پچھلی کسر پوری ہوگئی ہے۔ ہم نے تو یہاں سے چلے جانے کا پروگرام بنا لیا ہے۔ حیدرآباد میں میرے دو بھائی ہیں، ان کا اچھا کاروبار ہے، وہ ہمیں کئی مرتبہ وہاں آنے کے لیے لکھ چکے ہیں۔ آرام چین سے تو رہیں گے۔ وہاں ہمیں کوئی خوف تو نہ ہوگا۔''

''نہیں، بیری، گھر تو نہیں فروخت کریں گے۔ اگر حالات سدھر گئے تو پھر اپنے گھر واپس آجائیں گے۔ اپنا گھر پھر اپنا گھر ہوتا ہے، اور تجھے پتا ہے —''

آگے اس کی بات میں نے ان سنی کردی۔ کچھ دیر ادھر ادھر دیکھ کر میں پیچھے ہٹ گیا۔ اتنی دیر میں چندراٹی ہمارے پڑوس کے گھر والی عمری کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ میں نیچے اتر آیا۔ پچھلے کمرے میں جا کر صوفے پر بیٹھ گیا، آہستہ آہستہ کمرے میں اندھیرا کم ہونے لگا۔ باہر صحن میں دھوپ کی ایک کرن میں غبار کے بہت سے ذرات ناچ رہے تھے۔ ان ذرات کو میں اوپر نیچے ہوتا دیکھتا، وقت کی رفتار دھیمی ہوتے ہوتے ہوئے رک گئی تھی یا شاید پیچھے کی طرف لوٹ گئی تھی۔ ایک آہ فضا میں ابھری۔ پھر ایک سسکی، ایک لمبی کراہ، درد پھیل رہا تھا گھر کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک۔ میرے چاروں

طرف ایک جال سا بنتا جا رہا تھا۔ اس جال میں پھنسا ہوا میرا احساس تڑپ رہا تھا—

''کیا بات ہے بھائی جی؟ درد بڑھ گیا ہے کیا؟''

''نہیں بیٹے، درد تو اتنا ہی ہے جتنا کہ ہر وقت ہوتا رہتا ہے لیکن کروٹ لیتے وقت میرے جوڑوں میں تکلیف ہوتی ہے۔''

''پتا نہیں بھائی جی، جوڑوں کی یہ تکلیف آپ کو کیسے ہوگئی۔ اچھے بھلے ہوتے تھے آپ، گھر کا سارا کام کرتے، سیڑھیاں چڑھتے اترتے۔''

''بیری، یہ پرانی باتیں تو اب خواب بنتی جا رہی ہیں۔ میرا دل کرتا ہے کہ میں یہاں سے اٹھوں، یہ چارپائی چھوڑوں، باورچی خانہ میں جاؤں، پتھر کے کوئلوں والی انگیٹھی لگاؤں، دودھ گرم کروں، چائے بناؤں—''

بھائی جی اب تو گیس کا زمانہ آ گیا ہے۔ چولہے کی ناب گھماؤ اور آگ جلالو۔ آپ تندرست ہو جاؤ، آپ کے لیے گیس والا چولہا لے آئیں گے۔ آرام کے ساتھ بیٹھے کام کرتے رہنا۔''

''لیکن بیٹے، میں باورچی خانہ تک جانے والی تو ہوں، تم جیتے رہو، ہمیں کاہے کی کمی ہے۔ تمھارے باؤجی کہتے تھے جتیں ہٹہ میں کوئی حکیم ہے، وہ مالش کے لیے کوئی تیل دیتا ہے، ہفتے میں بندہ رو بصحت ہو جاتا ہے۔ مجھ سے بھی کمزور مریض اس نے ٹھیک کر دیے ہیں۔ ہمیں پتا ہی اب لگا ہے، نہیں تو پہلے ہی اس کے پاس چلے جاتے۔ لیکن جو دکھ برداشت کرنا ہے وہ ہر حیلے برداشت کرنا پڑتا ہے— اچھا، اپنی اپنی قسمت۔''

''باؤجی اتنی دیر سے کہاں گئے ہوئے ہیں؟ انھوں نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا، اس طرح تو ٹھیک نہیں، بغیر مطلب، ایسے ہی دوڑتے پھرو۔''

''نہیں بیری، بغیر مطلب نہیں، وہ کسی کام گئے ہیں۔ پتا نہیں ہوتا بندے کو کب ضرورت پڑ جائے پیسوں کی۔ ویسے تو واہگورو خیر خیریت رکھے لیکن بندہ مٹی کا پتلا ہی تو ہے نا آخر۔''

''لیکن بھائی جی، ہمارے ہوتے ہوئے آپ کو کاہے کی فکر؟ آپ کے سارے بیٹے

کماؤ ہیں، آپ ایک بار بات منھ سے نکالو سو مرتبہ پوری کرتے ہیں۔''

''یہی تو مشکل ہے بیٹے، بات منھ سے نکلتی ہی نہیں، دل کی بات دل میں ہی رہ جاتی ہے۔ یونہی جھوٹا پڑنے والی بات کیوں کرے بندہ اور کیا؟ تم اوپر ہماری بہت سی امیدیں تھیں کہ تجھے نوکری ملے گی تو گھر کی حالت سدھرے گی۔''

''نوکری نوکری میں فرق ہوتا ہے جھائی جی۔ اگر صرف تنخواہ والی نوکری ہو تو گھر کی حالت سدھرنے کی بجائے اور بگڑ سکتی ہے۔ شرافت کے ساتھ جینا بہت مشکل ہوتا جارہا ہے، ہر کسی سے ڈرنا پڑتا ہے، کیا معلوم کون بے عزتی کر دے۔''

''ویسے تو تم سارے ہی لائق و فائق نکلے، لڑکیاں بھی اپنی اپنی جگہ اچھی ہیں لیکن گھر کا دلدر نہیں نکل سکا۔ ترے ساتھیوں نے کوٹھیاں بنالی ہیں اور کاریں رکھی ہوئی ہیں جیسے تیسے لوگ اپنے اپنے ڈھنگ سے راستہ ڈھونڈ ہی لیتے ہیں۔ تمھاری اپنی قبیلداری ہے، رب تمھیں خوش و خرم رکھے، ہماری کوئی بات نہیں — بہت گزر گئی تھوڑی رہ گئی۔''

''باہر کے دروازے پر دستک ہو رہی ہے، بیٹا! کھڑے ہو کر دیکھنا شاید تمھارے باؤ جی آگئے ہیں، میرے جوڑوں کی مالش کے لیے تیل لے کر آگئے ہیں۔''

چونک کر میں نے باہر کا دروازہ کھولا۔ سامنے رمیش کھڑا تھا۔ پہلی نظر میں تو میں اسے پہچان ہی نہ سکا۔ اپنی طرف ہڑ بڑ مجھے دیکھتے ہوئے اس نے بلند آواز میں پوچھا — ''کیا بات ہے، بلبیر؟ بہت گھبرایا ہوا ہے؟ خیریت تو ہے؟'' اتنی بات کہہ کر وہ اندر آگیا۔

''میں بڑی دیر سے سویا ہوا تھا، دروازے پر دستک کی وجہ سے میں جاگ گیا۔'' آنکھیں ملتے ہوئے میں نے جواب دیا۔

''یہ بھی کوئی سونے کا وقت ہے۔ شام کے پانچ بج چکے ہیں، چل ہماری طرف، یوں اندر بیٹھے رہنے کا کیا مطلب۔''

''اصل میں رمیش، مجھے جھائی جی کے متعلق خواب آرہا تھا۔ وہ میری مذمت کر رہے تھے کہ میں نے ان کی پوری طرح خدمت نہیں کی۔''

''یونہی ترے دل کا وہم ہے۔ جھائی تو تمھاری تعریفیں کرتے نہیں تھکتے تھے۔ ان کو

گزرے ہوئے تین سال ہو چکے ہیں تو اب بھی اس طرح کی باتیں سوچ جا رہا ہے۔ اچھا یہ بتا آج کل باؤ جی کہاں ہیں؟''

''پٹیالہ سے وہ اب گورداس پور آگئے ہیں، اگلے ماہ وہ میرے پاس لدھیانہ آئیں گے۔''

''ان کی صحت کیسی ہے؟''

''ویسے تو وہ ٹھیک ہیں لیکن نظر کافی کمزور ہوگئی ہے، زیادہ چل پھر نہیں سکتے۔''

''یہاں رہتے تھے، چھندی کے پاس، تو چوک تک ہو آتے تھے، بھائی سادھو کے گوردوارے ماتھا ٹیک آتے تھے، اپنے دوست آتما سنگھ کے پاس جا بیٹھتے تھے۔ یہاں سے جا کر نئی جگہوں پر دل لگانا کوئی آسان بات نہیں ہوتی۔ یہاں سے جاتے وقت کہتے تھے، میں زیادہ چھندی کے پاس ویہ کا ہی رہوں گا — اس کے بچوں کے ساتھ میرا دل لگا رہتا ہے۔''

''رمیش باؤ جی، یہاں سے جاتے ہوئے تمھیں ملے تھے؟ تم زیادہ تو ر پر ہی رہتے ہو۔''

''پھر بھی گلی محلے کی ساری خبر رکھتے ہیں۔ یہ نہیں تمھاری طرح نیچی نظروں کے ساتھ گلی میں سے گزر گئے۔''

''تمھارے گھر کے آگے سے گزرتے ہوئے پہلے میں تمھاری کھڑکی کی طرف دیکھتا ہوں، پھر ڈیوڑھی میں کہ شاید تم کہیں نظر آجاؤ۔''

''دیکھتے ہی ہو نا، پوچھتے تو نہیں کسی کو کہ میں یہیں پہ ہوں کہ باہر گیا ہوں۔ اب بھی تم کونسا اپنے آنے کے بارے میں کسی کو بتایا ہے۔''

''آج تو، رمیش، میں چوروں کی مانند اپنے گھر داخل ہوا ہوں۔ لگتا تھا، کچھ نہ کچھ میرے ساتھ ہو جائے گا۔''

''پہلے تو تم اتنے ڈرپوک نہیں ہوتے تھے، اب تجھے کیا ہو گیا ہے؟ کسی کی کیا مجال ہے، تجھے کچھ کہہ جائے۔''

''یونہی باتیں ہی ہیں، جب مصیبت آتی ہے، اکیلے کو ہی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ اس وقت فسادات میں ہم اپنے کسی مسلمان دوست کو نہ بچا سکے — بس ہاتھ ملتے رہ گئے۔''

''پتا نہیں، ہیری ہوتا کیا ہے؟ ہمارے آدرش ہی بیچ میں رہ جاتے ہیں اور گھٹیا قسم کے بندے سارا کھیل بگاڑ دیتے ہیں۔ ہم جو گھروندے اپنے دلوں میں بناتے رہتے ہیں۔ انھیں یہ دقیانوسی لوگ منٹوں سکنڈوں میں توڑ پھوڑ دیتے ہیں۔''

''ہمیشہ ان کی ہی حکومت صدیوں سے چلی آ رہی ہے اور کئی صدیوں تک اور چلتی رہے گی۔ دنیا کبھی بھی نہیں بدلے گی۔''

''تم اتنے مایوس مت ہوں، ہیری — کبھی نہ کبھی، بھلے دن آئیں گے۔''

''کبھی نہ کبھی ہی نا — لیکن اتنی دیر؟''

''اتنی دیر، ہیری، ڈر، وٹ زمانہ کٹ، والی بات ہے۔''

''یہی تو ہوتا نہیں، رمیش مجھ سے — بلکہ ہم سے۔''

''شکر ہے'' تم نے مجھے ایک بار پھر اپنے ساتھ ملایا تو ہے — اچھا اب چل ہماری طرف چائے پئیں۔''

رمیش کے ساتھ میں اس کے گھر چلا گیا۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ میں ایک مدت کے بعد ان کے گھر آیا تھا۔ کئی مرتبہ تو ہماری ایک دوسرے کے ساتھ ملاقات ہی نہ ہوتی، کبھی کبھار اگر ہم مل بھی جاتے تو سکھ دکھ پوچھنے سے زیادہ کوئی بات نہ ہوتی۔ اگر کبھی کھڑکی میں کھڑا وہ مجھے نظر آ بھی جاتا تو ہیلو ہیلو، سے آگے بات نہ چلتی۔ زندگی کی مصروفیات دن بدن بڑھتی جا رہی تھیں۔ اس کے تین بچے تھے، دو لڑکیاں اور ایک لڑکا، تینوں شادی شدہ تھے۔ اس کا لڑکا، کیول، ان کے ساتھ رہتا تھا۔ بڑی لڑکی کی شادی ممبئی میں ہوئی تھی۔ چھوٹی لڑکی چنڈی گڑھ رہتی تھی۔ میری بھی لڑکیاں کچھ اس طرح کی تھیں۔ دو لڑکیاں شادی شدہ تھیں اور لڑکا ابھی ایم ڈی کر رہا تھا۔ پاکستان بننے سے لے کر اب تک بہت عرصہ گزر چکا تھا۔ اس گلی میں رہنے والے کئی بزرگ کوچ کر گئے تھے۔ جوان

بوڑھے ہو گئے تھے اور بچے جوان بنتے جا رہے تھے۔ ایک سلسلہ تھا، ترتیب وار اور لگاتار۔ بات کہیں کی کہیں پہنچ چکی تھی لیکن انسانی ذہن اُسی پرانے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ وہ خواب جو ہماری نسل نے دیکھا تھا، جلیاں والے باغ کی مٹی کو ماتھے کے ساتھ لگا کر بے کار ہی گیا تھا۔ آپادھاپی والی ذہنیت نے انسان کے روشن مستقبل کو داغدار کر دیا تھا۔ 'نہ جادہ، نہ منزل، نہ روشنی، نہ چراغ' زندگی اندھیرے راستوں میں بھٹک رہی تھی۔ روشنی کا کہیں بھی نام و نشان نہیں تھا۔ تاریکیوں میں انسانیت سسک رہی تھی۔ وہ پسینہ جو ہم نے لاہور کی سینٹرل جیل میں، مئی جون کے مہینوں میں بہایا تھا، کسی کام نہیں آیا۔ رمیش کے سر پر بھی تو اس وقت پولس کی لاٹھی لگی تھی جس سے اس کا سر پھٹ گیا تھا۔ زمین پر گرتے ہی وہ بے ہوش ہو گیا تھا—

''رمیش تمھارے سر میں لاٹھی لگنے کا نشان ابھی بھی ہے کہ مٹ گیا؟''

''نہیں مٹا نہیں — بلکہ اور بڑا ہو گیا ہے۔''

''وہ کیسے—؟''

''لے—دیکھ لے۔''

اس نے ایک جگہ سے اپنے سر کے بال ہٹا کر سر میرے آگے کر دیا۔ سن چھیالیس میں لگا وہ نشان اب بہت بڑا ہو گیا تھا۔ رمیش اپنے اس نشان کو بالوں کے ساتھ ڈھک کر رکھتا تھا۔ ویسے بھی یہ نشان اس کے سر کے پچھلی طرف تھا، دائیں کان سے تھوڑا اوپر۔

''تمھارا بازو تو، بڑی جلدی ہی ٹھیک ہو گیا تھا۔''

''ٹھیک تو ہو گیا تھا لیکن جوڑ والی گانٹھ اب زیادہ چبھنے لگی ہے۔''

''چلو چھوڑو، یہ پرانی باتیں — کوئی نئی بات کرو۔''

''نئی بات، رمیش؟ کس طرح کی نئی بات؟ نئی باتیں تو یہاں ہر روز واقع ہو رہی ہیں۔ گزشتہ سال جون چوراسی میں اکال تخت پر ہوا فوجی حملہ، اکتیس اکتوبر کو واقع ہوا تکلیف دہ سانحہ، نومبر کے پہلے ہفتے دلی اور ملک کے دوسرے شہروں میں مچا کہرام — نادر شاہی قتلِ عام اور احمد شاہی لوٹ کھسوٹ۔''

''بیری، میں نے تو تمھیں کوئی نئی بات کرنے کو کہا تھا، لیکن تم تو پرانی باتیں چھیڑ بیٹھے ہو۔''

''پرانی ضرور ہو گئی ہیں یہ باتیں، ویسے بہت پرانی بھی نہیں ہوئیں۔ ابھی کل کی ہی باتیں ہیں، زیادہ نئی بات تو پھر وہی ہے جو کل چوپڑے کے قتل والی پیش آئی تھی اور جو آج ایک دودھی کی موت واقع ہوئی۔ دونوں غلط، قابلِ مذمت، مسئلوں کو اور الجھا دینے والی۔''

''بیری، مجھے تو سب سے نئی بات آج تمھاری اپنی ہی گلی میں، اپنے ہی گھر میں، ایک مجرم کی طرح داخل ہونا لگتا ہے۔''

اس کے بعد دونوں چپ ہو گئے۔ ہمارے دونوں کے چہروں پر مایوسی تھی، بوکھلاہٹ تھی۔ ایک دوسرے سے ہم نظریں چرا رہے تھے۔ اتنے میں کسی کے اوپری سیڑھیاں اترنے کی آواز آئی۔ رمیش کی بہو چائے کی ٹرے لے کر آئی۔ ٹرے کو میز پر رکھ کر اس نے میرے پاؤں چھوئے۔ میرا ہاتھ از خود اس کے سر پر رکھا گیا اور میرے منھ سے اس کے لیے دعا نکلی — 'سکھی رہو۔' ہم دونوں کو چائے دے کر وہ سیڑھیاں چڑھ گئی۔ چائے کا میں نے ایک گھونٹ بھرا، چائے مزے دار تھی۔ دوسرا گھونٹ میں بھرنے ہی والا تھا کہ رمیش نے بسکٹ والی پلیٹ میرے آگے بڑھا دی۔ ایک بسکٹ اٹھا کر میں نے اسے دانتوں تلے دبایا۔ میرے ساتھ ہی رمیش نے بسکٹ کو منھ میں ڈالا۔ اس طرح کچھ دیر ہم چائے پیتے رہے اور بسکٹ کھاتے رہے۔

پھر چائے کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے میں نے رمیش سے کہا— ''تم بھی عجیب آدمی ہو۔ تمھارے یہاں ہونے کی وجہ سے ہی میں نے ساری گلی کو معاف کر دیا ہے۔ نہیں تو میں ان لوگوں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے ناراض ہو چلا تھا۔''

''اتنا بھی ناراض نہ ہونا کہ پھر ان کو گلے نہ لگا سکو۔ پھر بھی یہ اپنے ہی گلی محلے کے لوگ ہیں۔ کئی مرتبہ گمراہ ہو جاتے ہیں، پھر سیدھے راستے پر بھی آ جاتے ہیں۔''

''ویسے تو انفرادی طور پر ٹھیک ہیں لیکن جب یہ اکٹھے ہو جاتے ہیں تو خدائی قہر بن جاتے ہیں لیکن یہ سب کچھ اچانک نہیں ہوتا۔ فرقہ پرستی ان کے دل و دماغ میں جو نفرت کا

جذبہ ابھارتی ہے، وہ آہستہ آہستہ زہر کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور پھر تباہی کی وجہ بنتی ہے۔''

''اگر چہ، بیری، پیار کا جذبہ بھی دائمی جذبہ نہیں، تو پھر نفرت بھی دلوں میں زیادہ دیر نہیں رہتی۔ یاد ہے نا، پاکستان بننے کے تھوڑا عرصہ بعد ہی دونوں اطراف کے لوگ واگھہ بارڈر پر ایک دوسرے کو ملنے کے لیے آنے شروع ہو گئے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے گلے مل کر کیسے روتے تھے۔''

''ہاں، میں بھی اس طرح ہی بھائیا جی کے ساتھ، سلمیٰ اور اس کی اماں بڈھاں سے ملنے گیا تھا۔ وہ بھی روئی تھی، کلائی میں چوڑی کے چبھ جانے کا بہانہ بنا کر، جو کرچ میری انگلی میں چبھ گئی تھی، اس کو اس نے اپنے رومال کے ساتھ صاف کر دیا تھا، جیسے میرے دل کے زخم پر مرہم لگا رہی ہو۔''

''میں نے تجھے جذباتی ہونے کے لیے نہیں کہا تھا، عام بات کی تھی۔ آج کے حالات میں بھی کوئی نہ کوئی حیلہ کیا جا سکتا ہے۔''

''اب ایسا کوئی جتن نہیں ہو سکتا، رمیش۔ انسان بنیادی طور پر خودغرض ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے متعلق ہی سوچتا ہے اور اپنے آرام کی خاطر ہی دوسروں کو دکھی کرتا ہے۔''

''ہمیشہ اس طرح نہیں ہوتا، بیری۔ انسان ایک دوسرے کی مدد بھی تو کرتے ہیں، ایک دوسرے کے کام بھی تو سنوارتے ہیں — اتہاس میری اس بات کا گواہ ہے۔''

''بے شک، بے شک — اس طرح کے دور کو ہم سنہری دور کہتے ہیں، لیکن انسانی تاریخ میں کتنے ایسے سنہری دور ہوئے ہیں؟ پتا نہیں کیوں آج مجھے بار بار اس بات کا احساس ہو رہا ہے:

لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ رمیش کے ماتا جی آ گئے۔ ان کے بال اب پورے سفید ہو چکے تھے اور آنکھوں کے پاس جھریاں گہری ہو گئی تھیں۔ ان کے آنے کے ساتھ میرے ذہن کا تناؤ کم ہوا۔ ایک بار پھر ان کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے پوچھا — ''آپ کی صحت کیسی رہتی ہے؟''

''ٹھیک ہوں، بیٹا — شکر ہے پرماتما کا۔''

''میں تو کہتا ہوں، بھائی جی، انسان کو جو بیماری لگے، وہ ٹھیک ہونے والی ہو۔''

''ہاں، لیکن یہ اپنے بس کی بات نہیں۔ تمھارے بھائی جی نے کتنی تکلیف اٹھائی، کتنا علاج ہوا، لیکن ٹھیک نہیں ہوئے۔''

''اچھے بھلے ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ کہنے لگے میرا بایاں کندھا درد کرتا رہتا ہے۔ پھر جوڑوں کا درد شروع ہوگیا۔ آہستہ آہستہ چارپائی کے ساتھ چارپائی بن کر رہ گئے۔''

''کیا کیا جا سکتا ہے، بیری؟ جب تکلیف آتی ہے، آگے پیچھے دیکھ کر نہیں آتی۔ رمیش کے باؤجی اچھے بھلے دفتر سے آئے، چائے پی، کچھ دیر اخبار پڑھی پھر نہانے چلے گئے۔ نہا کر آئے تو کہنے لگے کہ میری چھاتی میں درد ہوتا ہے۔ اسی وقت ڈاکٹر بلایا، اس کے آنے سے پہلے ہی آنکھیں موند لیں۔ اب بتاؤ کیا کرے بندہ، دو دن چارپائی پر نہیں پڑے، دوا دارو کرنے کا موقع نہ دیا، ہم ان کی کوئی خدمت نہیں کر سکے۔''

''بھائی جی —''، رمیش نے ٹوکا ''اب ان باتوں کا کیا فائدہ۔ آپ کو سانس کی تکلیف ہے، اس طرح اور بڑھ جاتی ہے۔ جو ہونا تھا، سو ہوگیا۔ رونے دھونے کے ساتھ انھوں نے واپس تو نہیں آجانا۔''

''ان کی باتیں چاہے میں نہ بھی کروں'' بھائی جی نے آنکھیں پونچھتے ہوئے جواب دیا، ''لیکن وہ مجھے کسی وقت نہیں بھولتے۔ ان کی عادت بڑی اچھی تھی، وہ مجھ سے کبھی بھی اونچی آواز میں نہیں بولے تھے۔''

''ایک بات بتاؤ، بھائی جی''، میں نے قدرے غصے سے پوچھا ''یہ گلی والے اب کس طرح کے ہوتے جا رہے ہیں، ان میں پہلے والا پیار اور محبت نہیں رہی۔ آپ کو یاد ہوگا، پھوپھی پاچھی کی شادی پر پندرہ دن پہلے گدھا شروع ہوگیا تھا، ہمارے گھر چندرانی دو دو گھنٹے گاتی رہتی تھی، ماہیا اور ٹپے، رات کو کتنی کتنی دیر تک ہمارے سامنے گھر کی ڈیوڑھی میں لڑکیاں گدھا ڈالتی تھیں۔ کس طرح سب عورتیں ناچتی ہوتی تھیں — 'جوگی آیا جوگی آیا' اس وقت تو مجھے بھی کئی گیت یاد ہوگئے تھے۔''

"بیری، اُن دنوں کی باتیں چھیڑ بیٹھا ہے"، رمیش نے کہا، "جب آپسی مراسم میں گرماہٹ ہوتی تھی، ایک دوسرے کے کام آنے کی تمنا ہوتی تھی، پیار کی کلیاں کھلتی تھیں، پسینے سے خوشبو آتی تھی ـــ"

"دیکھو رمیش ـــ"، میں نے ذرا اونچی آواز میں کہا، "تم جذباتی باتیں کر رہے ہو، میں اپنے زخموں پر سے کھرنڈ اتار رہا ہوں۔ یاد ہے نا، بھایاجی نے گھیدے جواری کو قید ہونے سے بچایا تھا، جوالا پرشاد کو نوکری پر بحال کروایا تھا، بیوہ ستیہ وتی کی لڑکی کی شادی اپنے ہاتھوں سے کی تھی ـــ پھر بھی یہ لوگ نظریں چرا کر ہمارے پاس سے گزر جاتے ہیں۔ ان میں وہ پیار محبت ہی نہیں رہی، خالص مفاد پرست، خودغرض اور طوطا چشم۔"

یہ بات کرتے کرتے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ رمیش کے بھائی جی بہت گھبرائے ہوئے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے اس طرح اونچی آواز میں بولتے رہنے پر شرمندگی محسوس ہوئی۔ وہ میرے بارے میں کیسے سوچتے ہوں گے۔ میں نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھا، کوئی بات کیے بغیر میں وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ رمیش نے مجھے کھانا کھا کر جانے کے لیے کہا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں جب سیڑھیوں کی طرف بڑھا تو دیکھا کہ رمیش کا بیٹا دو تھالیاں ہاتھوں میں لیے آرہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے پاؤں رکے لیکن گھبراہٹ کے عالم میں نیچے کی سیڑھیاں اتر گیا۔ گلی میں سے جلدی جلدی گزرتے ہوئے میں اپنے گھر کے اندر چلا گیا۔ بتی جلائی، باورچی خانہ میں رکھی ہوئی بالٹی میں سے پانی پیا، کڑوا اور کسیلا پانی ـــ شاید میرے منھ کا ذائقہ ہی بگڑ گیا تھا۔ اتنے میں رمیش وہ دونوں تھالیاں ہاتھوں میں تھامے ہمارا چبوترہ چڑھ آیا۔ پھر وہ مجھ سے بغلگیر ہوا اور بھری ہوئی آواز میں کہنے لگا، "یوں نہ کرو، بیری ـــ ایک دوسرے کے ساتھ بانٹا ہوا درد کا رشتہ کبھی نہیں ٹوٹتا، یہ ساری باتیں وقتی ہیں، تم نے ہی تو ایک مرتبہ کہا تھا، 'چھٹ جائے گا گھور اندھیرا' پھر آپ اس طرح کیوں سوچتے ہو۔"

رمیش کے جانے کے بعد میں نے پلنگ پر پڑی چادر کو جھاڑا۔ اوپر والا سرہانہ اٹھایا، پھر نچلے کو اٹھایا۔ وہاں ایک چھپکلی مری پڑی تھی۔ مجھے بڑا عجیب لگا۔ وہاں کوئی بچھو وغیرہ ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی لیکن اس جگہ۔ یہ چھپکلی کا کیا کام؟ کئی کئی مہینے مکان بند رہنے کی وجہ سے وہاں کچھ بھی پیدا ہوسکتا تھا۔ اس گھر میں شاید سانپ کا گھر نہیں تھا۔ ہمارے بغل کے پرانے مکان میں بہت سانپ نکلا کرتے تھے۔ اس لیے رات ڈھلنے پر سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے ہم بہت کھٹکا کرتے تھے تاکہ سانپ ادھر ادھر ہوجائے۔ زیادہ تر سانپ کوٹھی میں سے غسل خانے کی نالی میں سے نکلا کرتا تھا۔ ہمارے گھر کی گلی کے سوراخ میں سے بھی کبھی کبھار سانپ آجاتا تھا۔ خیر — اس وقت گھر میں سانپ نہیں تھا اور نہ ہی کبھی بچھو نظر آیا تھا۔ چھپکلیاں بہت تھیں، اسی لیے ایک چھپکلی میرے سرہانے نیچے پڑی تھی۔ مری ہوئی، پھولے ہوئے پیٹ والی۔ پنکھی کی ڈنڈی کے ساتھ میں نے اسے کاپی کے گتے پر ڈالا اور باتھ روم کی طرف لے گیا۔ بتی جلائی تو بہت سارے کاکروچ ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ چھپکلی کو فلش میں پھینکنے کی کوشش کی لیکن وہ باہر ہی گر پڑی۔ دو تین کاکروچ اس کی طرف دوڑے۔ کسی مردہ چیز کی طرف زندوں کی کشش فطری ہونے کے باوجود قابل نفرت تھی۔ خیال آیا کہ زندگی اپنے آپ موت کی طرف کھنچی چلی جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ کسی چتا کی لاش کو شمشان بھومی کی طرف لے جارہے لوگ موت سے ڈرتے نہیں، بلکہ زندگی کو للکارتے ہیں۔

باتھ روم کی بتی بند کرکے میں بیڈ روم میں آگیا۔ اصل میں بیڈروم بھی یہی تھا، ڈرائنگ روم بھی یہی اور ڈائننگ روم بھی یہی۔ مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ دل نے کچھ پڑھنے

کو چاہا لیکن وہاں نہ کوئی رسالہ اور نہ ہی کوئی کتاب تھی۔ دونوں سرہانے میں نے ایک مرتبہ پھر زور زور کے ساتھ جھاڑے اور سوکھی کے بُنے ہوئے پلنگ کی پائنتی کی طرف پھینک دیے۔ تھوڑی دیر پلنگ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھنے کے بعد میں سرہانوں پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ مجھے عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ کھڑکی کے شیشے میں سے میں نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک ٹکڑے میں سے مجھے کچھ ستارے چمکتے ہوئے نظر آئے۔ بہت سال پہلے پڑھا ہوا ایک شعر میرے ذہن میں ابھرا:

ہمیں تو آج کی شب پو پھٹنے تک جاگنا ہوگا
یہی قسمت ہماری ہے ستارو تم تو سو جاؤ

لاشعوری طور پر میں یہ شعر گنگنانے لگا۔ آہستہ آہستہ میری آواز بلند ہوگئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری آواز آرکیسٹرا کی شکل میں سارے کمرے میں پھیل رہی ہو۔ ایک دائرے کی شکل میں میری آواز چھت کی طرف گئی۔ اس کے بعد آواز کا ایک اور دائرہ اوپر کو گیا۔ ایک ایک کر کے کئی دائرے چھت کے ساتھ جا ٹکرائے۔ میرے چاروں طرف گنبد کی آواز پھیلتی جا رہی تھی۔ کسی مقبرے میں پڑا میں اپنے اوپر سے سنگ مرمر کی سلیں اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن ہر نئی کوشش کے ساتھ میں نیچے دھنستا جا رہا تھا، اور نیچے — شاید پاتال میں —

''ڈیڈی جی، آپ یہاں بیٹھے ہو، باہر کی آپ کو کوئی سدھ بدھ نہیں۔'' میرے لڑکے نے کھڑکی کے شیشے پر انگلی کے ساتھ کھٹکا کرتے ہوئے کہا۔

''آجاؤ، آجاؤ — گوریندر جیت، اندر آجاؤ۔'' میرے دوست پروفیسر پیارا سنگھ نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''انکل، آپ نے ٹی وی پر خبریں نہیں سنیں؟ پنجاب کے سارے شہروں میں کرفیو نافذ ہوگیا ہے اور گاؤں والوں کو بھی گاؤں سے باہر نہ آنے کی ہدایت کی گئی ہے۔'' گوریندر جیت کے ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا۔

''ہوا کیا ہے پوری بات تو بتاؤ؟'' میں اپنے ہاتھ والا گلاس خالی کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہرمندر صاحب کو فوج نے گھیرے میں لے لیا ہے، گولہ باری ہورہی ہے، بابا کار مچی ہوئی ہے۔" یہ کہتا ہوا وہ باہر گیٹ کی طرف چل پڑا۔

شام کو میرا گھر سے باہر جانے کا اتفاق کم ہی ہوتا تھا۔ اس وقت میں گھومتا گھماتا اپنے دوست کے گھر چلا گیا تھا اور اس نے ازخود دو پیگ بنا کر ٹیبل پر رکھ دیے تھے۔ پہلا پیگ پی کر جب میں اٹھنے لگا، تو 'فار دی روڈ' کہہ کر اس نے ایک پیگ اور بنا دیا۔ یہ بات تو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ حکومت ہند اتنی بڑی کارروائی کرنے کا ارادہ کر لے گی۔ اس شام کو ہم دونوں باپ بیٹا جب گھر کی طرف آرہے تھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے قیامت آگئی ہو۔

راستے میں ہمیں کوئی صورت نظر نہ آئی۔ ڈر تھا کہ کہیں پولس والے کرفیو کی خلاف ورزی کرنے کے جرم میں پریشان نہ کریں۔ لیکن اس طرح کی کوئی بات نہ ہوئی۔ گھر پہنچے تو سب کے چہروں پہ ڈر اور خوف صاف ظاہر تھا۔ پتا نہیں کیا ہونے والا تھا؟ ہرمندر صاحب پر پہلے بھی حملے ہوئے تھے لیکن وہ غیر ملکی حملہ آوروں کی طرف سے ہوئے تھے، نہ کہ اپنے ہی ملک کی فوجوں کی طرف سے۔ یہ جو کچھ اب ہورہا تھا، کون کروا رہا تھا کیوں کروا رہا تھا؟ یہ فوجیں، 'کون سے ملک سے آئی تھیں' اور ان کا ارادہ کیا تھا؟ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی تو ہے لیکن یوں نہیں دہراتی۔ یہ تو غضب ہورہا تھا، اپنوں کی طرف سے اپنوں پر۔ اپنے لوگ، اپنی سرکار، اپنے نمائندے، 'ایک بادشاہ نے درویش کا گھر لوٹ لیا' صدیوں سے یونہی ہوتا آیا تھا، کوئی نئی بات نہیں ہورہی تھی۔ پھر بھی یہ بات نئی تھی، انہونی۔ کیرتن رک گیا تھا، الہی نغمہ بند ہوگیا تھا۔ کیا اسی دن کے لیے یاروں نے دار کو چوما تھا؟ آزادی کے گیت گائے تھے؟ اس صبح کا انتظار کیا تھا جب لال قلعے پر ترنگا لہرایا جائے گا؟ چالیس سال پہلے ایک مشاعرے میں سنا ہوا ایک شعر، بار بار میرے دماغ میں شہد کی مکھی کی طرح گردش کرنے لگا:

منصور تو سر دے کے بھی زندہ رہا لیکن
جلاد پہ ہے قتل کا الزام ابھی تک

دروازہ بڑے زور کے ساتھ کھٹکا، میری آنکھ کھل گئی۔ کون تھا اس وقت باہر؟ میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھ نہ سکا۔ دروازہ پھر کھٹکا، اندھیرے میں ہی میں نے بتی کا سوئچ ڈھونڈا، کمرے میں سے صحن میں، ڈیوڑھی میں، پھر دروازے کے پاس ''کون ہے؟''

''جی میں ہوں، چوکیدار۔''

''ہاں، کیا بات ہے—''

''اندر، آپ ہی ہو نا سردار جی؟''

''ہاں، کیا ہوا؟''

''دروازے کے نیچے سے روشنی آ رہی تھی۔ میں گھبرا گیا کہ پہلے تو کبھی ایسا ہوا نہیں۔''

''فکر والی بات نہیں، تم نے مجھے پہلے گلی میں آتے جاتے نہیں دیکھا۔ میں تو کل رات سے آیا ہوا ہوں۔''

''خیال نہیں کیا، سردار جی، ایک دو بار ہی آپ آئے گئے ہوں گے۔ بال بچے بھی آئے ہیں؟''

''نہیں اور کوئی نہیں آیا۔''

''اچھا، سردار جی — رام رام۔''

اوپری سیڑھیوں والی بتی میں نے بجھا دی۔ رات کو پتا نہیں یہ کیسے جلتی رہ گئی تھی۔ باتھ روم کا دروازہ میں کھولنے لگا لیکن اچانک رک گیا۔ مری ہوئی چھپکلی کے گرد کاکروچوں کے جھرمٹ کا مجھے خیال آ گیا۔ نہیں، نہیں — باتھ روم جانے والا کام یہاں بجلی کے میٹر کے نیچے بیٹھ کر بھی بآسانی ہو سکتا تھا بلکہ یہ اندازہ کچھ آسان تھا، بے خوف و خطر۔ صحن میں سے گزرتے ہوئے میں نے اوپر کی جانب دیکھا۔ آسمان کچھ نیچے کی طرف کھسک آیا لگتا تھا۔ رات خاموش تھی۔ پرسکون، پرسکوت بیقراری کے عالم میں میں دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔ میرے خیالات کا انتشار ویسے کا ویسے قائم تھا۔ حقیقت کی پرچھائیاں کیوں میرا پیچھا کر رہی تھیں؟ آپریشن بلیو اسٹار کو ہوئے تو سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ یہ بھیانک

واقعہ اب میرے احساس کا حصہ بن چکا تھا۔ ہرمندر صاحب کا زیادہ نقصان نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس کی بے حرمتی کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی تھی۔ اوپری چھت پر بیڑ (مقدس کتاب کا نسخہ) کھلی پڑی تھی لیکن پاٹھ کرنے والا اپنے گھٹنوں میں سر دے کے بیٹھا ہوا تھا۔ سنہری طاق میں سے آئی ایک گولی اس کے سینے میں داخل ہوچکی تھی۔ لہو کے چھینٹے اس کے سامنے کھلے دونوں پتروں پر پڑے تھے۔ ایک طرف جوت جل رہی تھی، اس گھپ اندھیرے میں نرنکاری جوت جل رہی تھی۔ اکال تخت کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ بس ملبے کا ایک ڈھیر۔ شستر گم، عجائب گھر برباد، سکھ ریفرنس لائبریری آگ کے حوالے۔

لیکن یہ سب کچھ مجھے آج کیوں یاد آ رہا تھا؟ یا خدا! میرے ساتھ یہ کیا ہو رہا تھا۔ رات کا سناٹا، کنوئیں کی گہرائی، مقبرہ میرے سر پر تعمیر ہو چکا تھا۔ گلی والے خاموش تھے، صرف ان کی بے رخی میرے ساتھ ہمکلام تھی۔ یہ لوگ، یہ سب لوگ، اپنی انا کے شکار، اپنے گرد و نواح میں قید، جذباتی، کمینے، خودغرض، لاچار، بیچارے لیکن بے حد خطرناک۔ انھیں ذوقِ گدائی بخشا گیا تھا۔ فیض احمد فیض نے ٹھیک ہی کہا تھا:

کوئی ان کو احساسِ ذلت دلا دے
کوئی ان کی سوئی ہوئی دم ہلا دے

نہیں نہیں — یہ بات نہیں، یہ بات بھی نہیں۔ پھر کونسی بات تھی جس نے ان کو جال میں پھنسا دیا تھا۔ سیاست دان انھیں ورغلا رہے تھے۔ مذہب کا غلط پرچار کرنے والے ان کو گمراہ کر رہے تھے۔ ضرورت مذہبی جنون کے روک تھام کی تھی۔ ڈاکٹر اقبال کے مطابق یہ ٹھیک ہے:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

لیکن فساد ہمیشہ مذہب کے نام پر ہی ہوتے تھے۔ سیاست دانوں کا یہ آخری حربہ ہے۔ جب ساری دوسری اسکیمیں فیل ہو جائیں، یہ اسکیم کامیاب ہو جاتی ہے۔ وطن پرستی کی آڑ میں ان لوگوں سے بڑے گھناؤنے گناہ سرزد ہو جاتے ہیں، 'ہم سب ایک ہیں' یا 'ہمارا دیش مہان' کہنے کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب کسی کو ان باتوں پر شک ہو یا

کہنے والوں کی نیت خراب ہو۔

''بات سنو، پروفیسر بلبیر، آپ آج لدھیانہ واپس چلے جاؤ''، میرے ساتھ پنجاب یونیورسٹی میں پیپر مارک کرنے آئے ہمارے کالج کے پروفیسر شرما نے کہا۔

''کیوں، کیا بات ہے؟ ایک دن کا کام اور ہے، کل جاؤں گا، ویسے ہوا کیا ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا حیرت کے ساتھ۔

''ابھی ابھی ریڈیو پر خبر آئی ہے کہ پردھان منتری کو گولیاں لگی ہیں، ان کی جان خطرے میں ہے؟'' ڈاکٹر شرما نے تحمل سے کہا۔

''بڑی غلط بات ہوئی ہے، لیکن میرا آج ہی یہاں سے چلے جانا کیوں ضروری ہے؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''اس لیے کہ ان پر محافظوں نے گولیاں چلائی ہیں، جو اتفاق سے سکھ ہیں''، ڈاکٹر شرما نے اپنے خشک ہونٹوں پر جیبھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا دلیل ہوئی، ڈاکٹر شرما؟ جنھوں نے مارا ہے الزام ان پر ہی آئے گا نہ کہ پوری سکھ قوم کو کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑے گا؟'' میں جذباتی ہو گیا تھا۔

''آپ تو پروفیسر صاحب، دلیل کی بات کر رہے ہو، لیکن ہجوم کو کون سمجھائے کہ ٹھیک کیا ہے اور غلط کیا۔ میرا تو یہی مشورہ ہے کہ آج ہی چلے جاؤ، آپ کا چیک میں لیتا آؤں گا — ٹھیک۔''

ٹھیک یا غلط، میں اسی شام چنڈی گڑھ سے لدھیانہ پہنچ گیا۔ کچھ پرچے نہ دیکھ سکنے کے باعث مجھے سو روپے نقصان کا احساس رہا۔ یہ احساس صرف ایک ہی دن رہا۔ اگلے دن دلی اور دیگر مقامات سے بہت سے تکلیف دہ واقعات کی خبریں ملیں — مار دھاڑ، قتل، آگ زنی، سب کچھ بڑے منصوبہ بند طریقے کے تحت ہو رہا تھا۔ غنڈوں کے کارنامے، غنڈوں کی سرپرستی میں — اتحاد و سالمیت کے نام پر۔ ان کو ایسا سبق سکھاؤ کہ نانی یاد آ جائے۔ 'وہ جوان راہوں میں مارے گئے — کیوں مارے گئے؟ کس نے مارا؟ کوئی حساب، کوئی کتاب؟ کدھر سے آئی یہ مصیبت کی گھڑی اور کدھر کو گئی؟' بس، اپنے نشان

چھوڑ گئی — دلوں پر، دماغوں پر، وقت اپنی چال چل گیا:

اٹھو وگرنہ حشر نہ اٹھے گا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

نلکے میں پانی کی دھار پیتل کے تسلے میں بڑے زور کے ساتھ گر رہی تھی۔ میری آنکھ کھل گئی۔ باہر اب بھی اندھیرا تھا کوئی چار بجے کا وقت رہا ہوگا، اس وقت۔ ہاں چار ہی بجے تھے کیونکہ کھلی ٹونٹیوں میں سے پانی چار بجے ہی گرتا تھا، تسلوں میں بالٹیوں میں، گاگروں میں۔ ہمارے باتھ روم کا تسلا بھرتا جا رہا تھا۔ پانی کے گرنے کی آواز بدلنی شروع ہوگئی۔ پہلے یہ آواز بھوکی پیاسی تھی، پھر رجی ہٹی پھر باہر کو اچھلتی ہوئی — تسلا بھر کر بہنے والی آواز، بستر سے میں اٹھا، باہر صحن میں گیا، اوپر دیکھا — آسمان کا رنگ بدل چکا تھا، ستارے مدھم پڑ گئے تھے، شاید سو رہے تھے — 'ہمیں یہ رات بھاری ہے ستارو تم تو سو جاؤ' باتھ روم میں گیا، چھپکلی وہاں نہیں تھی، کاکروچ بھی یہاں نہیں تھے۔ شاید شکاری اپنے شکار کو کھینچتے ہوئے اپنے ساتھ ہی لے گئے تھے۔ نام و نشان مٹانے کے لیے۔ تسلے میں سے پانی بہہ رہا تھا، نلکے کی دھار اور تیز ہوگئی تھی۔ نلکا بند کر کے میں باہر آ گیا۔ گلی کے کنوئیں پر کوئی نہا رہا تھا اور مدھم آواز میں گا رہا تھا — 'پھر آن ملو سجنا' میرے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکان پھیل گئی۔ میں دوبارہ کمرے میں چلا گیا۔ دیوار کے ساتھ دونوں سرہانے لگا کر نیم دراز ہوگیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں تخت طاؤس پر بیٹھا ہوں۔ جہاں پناہ، شاہ جہاں، ظل الٰہی، پتا نہیں کہاں سے میرے ہاتھوں میں جام جہاں نما آ گیا۔ اس پیالے میں میں پورے جہاں کے حادثات و واقعات دیکھ سکتا تھا۔ اچانک میرے ہاتھوں سے وہ پیالہ چھوٹ گیا۔ گرتے ہی وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ ایک ٹکڑے پر میری نظر پڑی۔ وہ ٹکڑا ذرا ہلا۔ وحشت زدہ ہو کر میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اتنے میں کسی نے میرے کانوں میں سرگوشی کی —

''بھاجی ڈرو نہیں، میں ہوں آپ کا چچازاد بھائی۔''

''کیا بات ہے روپندر، یہاں کیسے؟''

''جب میں فسادیوں کے ہاتھوں مرتے مرتے بچا تھا آپ مجھے ملنے نہیں آئے تھے۔''

''یہ کب کی بات ہے؟''

''آپ بھول گئے؟ وہی چوراسی کی پہلی نومبر، میں تو بس مر ہی چلا تھا، اس وقت''

''ہوا کیا تھا روپندر؟''

''ہوا کیا تھا بھاجی، روز کی طرح میں اس دن شام پانچ بجے دفتر سے گھر کی طرف چل نکلا۔ آدھے گھنٹے کی کار ڈرائیونگ کے بعد میں نے دیکھا کہ لوگوں کی بھیڑ میری طرف بڑھتی چلی آرہی تھی۔ ان کے ہاتھوں میں سریے تھے، پتھر تھے، لاٹھیاں تھیں۔ میں نے کار آہستہ کرلی۔ ایک پتھر میری کار کے شیشے پر لگا، تین چار لاٹھیاں کار کے بونٹ پر لگیں، کسی نے کار میں سے باہر کھینچا، میری پگڑی نیچے گر پڑی، کسی دوسرے نے مجھے جوڑے سے پکڑ لیا اور سڑک پر گھسیٹتا ہوا دور تک لے گیا، لاٹھیاں میرے اوپر برس رہی تھیں، میرے ماتھے سے لہو بہہ کر میرے ہونٹوں میں سمٹ رہا تھا۔ اس حالت میں میرے منہ سے نکلا — 'اے سچے پادشاہ!' سچ پوچھو تو میں نے موت کو اس وقت اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا۔

''عام طور پر بندے کو رب بھی موت کو سامنے دیکھ کر ہی یاد آتا ہے — ٹھیک ہے میری بات؟''

''پتا نہیں — لیکن اس وقت موت میری آنکھوں کے سامنے ایک پتنگے کی طرح گھوم رہی تھی۔ اتنے میں کچھ اور کاریں اور اسکوٹر وہاں آکر رکے۔ فسادیوں کا دھیان ادھر چلا گیا۔ جیسے تیسے میں نزدیک کی ایک کوٹھی کی باڑ میں جا چھپا، پھر میری آنکھیں بے ہوشی کے عالم میں بند ہونی شروع ہوگئیں — ''یعنی:

ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

والی کیفیت طاری ہوگئی۔''

''کچھ کہہ لیجیے، بھاجی، جس تن لگے وہی تن جانے۔ مجھے جب ہوش آیا تو میں اس

کوٹھی کے بیڈروم میں پڑا تھا۔ میرے ماتھے پر پٹی باندھی ہوئی تھی میرے جسم پر سوزش تھی۔''

''مطلب یہ کہ تمھاری وہ تمنا پوری ہوگئی:

مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر میں نے ایک بازو کو اٹھانے کی کوشش کی، وہ نہ اٹھایا گیا، ٹانگ کو ہلانا چاہا، وہ بھی نہ ہل سکی۔ ادھر ادھر دیکھا، کوئی نظر نہ آیا، سامنے دیوار پر عیسیٰ مسیح کی ایک تصویر لٹک رہی تھی، کراس پر ٹنگا کرائسٹ۔''

''تجھے خیال آیا ہوگا، روپندر کہ کوئی تو ہے ترے دکھ کی دوا کرنے والا۔''

''ہاں بھاجی، میرے دل کو بڑی تسلی ملی۔ اتنے میں میری اماں جیسی ایک عورت اندر آئی۔ ایک مرتبہ تو میں سچ مچ دھوکا کھا گیا۔ اس نے ممتا بھری نظروں کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ میرا حال پوچھا، تھرمامیٹر لگایا، دوائی دی اور چلی گئی۔''

''کیا ٹائم تھا اس وقت؟''

''میں نے گھڑی تو نہیں دیکھی تھی لیکن اس وقت، سورج کی پہلی کرنیں کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔''

''پھر — روپندر؟''

''دوبارہ جب وہ کمرے میں آئی تو اس کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا۔ اس کے پیچھے اس کے شوہر، دو لڑکے اور ایک لڑکی بھی اندر آ گئی۔''

''لڑکی کتنی عمر کی تھی؟''

''یہی کوئی سترہ اٹھارہ سال کی — کیوں؟''

''برا نہ ماننا، روپندر — تری کہانی کچھ فلمی رنگ اختیار کرتی جا رہی ہے۔''

''بھاجی، میری کہانی آپ سن نہیں سکتے، اسی لیے ہنسی میں ٹال رہے ہو۔ ہنسنا بھی تو رونے کا دوسرا نام ہے۔''

''وہ ہے نا اردو کے کسی شاعر کا مصرع :

ہنستا ہے اپنے حال پہ انساں کبھی کبھی

یہ کتنی بڑی حقیقت ہے۔

''انھوں نے بھاجی مجھ سے ہمارے گھر کا فون نمبر پوچھا۔ پاپا اور ماما کے ساتھ میری بات ہوئی۔ وہ ساری رات نہ سو سکے تھے۔ میری آواز سن کر ان کو تسلی ہوئی۔ وہ مجھے لے جانے کے لیے آنا چاہتے تھے لیکن مسٹر جوزف نے انھیں روک دیا۔ حالات ابھی بھی بہت خراب تھے۔ دلی میں بہت خون خرابہ ہو رہا تھا۔ شعلے بھڑک رہے تھے، کہرام برپا تھا۔''

''تجھے کتنی چوٹیں لگی تھیں۔''

''میرا سر دو جگہوں سے پھٹ گیا تھا۔ دو تین پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں، کالر بون کریک ہو گئی تھی۔ میرے جسم پر بہت گہری چوٹیں تھیں۔''

''یہ تجھے کس جرم کی سزا ملی تھی، روپندر؟''

''یہی تو میں پوچھتا ہوں کہ مجھے مارنے آئے وہ لوگ کون تھے؟ وہ میرے دشمن بھلا کیوں کر ہوئے؟ وہ مجھے صرف اس لیے ختم کر دینا چاہتے تھے کیونکہ میرے سر پر پگڑی تھی، میرے چہرے پر داڑھی مونچھیں تھیں اور میں ان گوروؤں کی اولاد تھا جنھوں نے ہندو دھرم کی حفاظت کی تھی۔ اپنا آپ قربان کر کے، اپنا خاندان نچھاور کر کے۔''

بیرونی دروازے پر زور کے ساتھ دستک ہوئی، جیسے کوئی دروازہ اندر کو دھکیل رہا ہو۔ میں ٹھٹھک کر اٹھ بیٹھا۔ گھڑی کی طرف دیکھا، سات بجنے والے تھے۔ صحن میں اچھی روشنی پھیل چکی تھی۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا میں دروازے تک پہنچا۔ باہر رمیش ہاتھ میں چائے کا گلاس تھامے کھڑا تھا۔

''کیا ہوا ___؟''

''ہوا کچھ نہیں، تم یہ چائے پکڑو۔ میں دو تین دنوں کے لیے ٹور پر جا رہا ہوں۔ تم بعد میں کھانا ہماری طرف ہی کھانا۔ اب بھی تم نہا دھو کر ناشتہ کرنے کے لیے ہماری طرف آجاؤ۔''

''دیکھو رمیش، یہ بات نہیں ہوگی۔ تم رات کھانا لے کر آئے تھے، اب چائے لے کر آئے ہو۔ اتنا ہی بہت ہے۔''

''یونہی باتیں نہ بنائے جاؤ، ہیری۔ جیسے میں نے کہا ہے، اسی طرح ہی کرو۔ میری ٹرین کا وقت ہو رہا ہے۔ مجھے اسٹیشن پر پہنچنے میں بھی دس منٹ لگ جائیں گے۔ کچھ دن اور رہو گے، میں بس گیا اور آیا، تمھارے ساتھ ابھی کھل کر بات چیت بھی نہیں ہوئی۔''

''میں تو آج ہی واپس چلا جانا چاہتا ہوں لیکن اتنی جلدی مجھ سے جایا نہیں جاتا۔ ایک دو ضروری کام رہتے ہیں۔ کرفیو اگر صرف دو گھنٹوں کے لیے کھلا ہے تو آج بھی مجھے گھر میں مقید رہنا پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے — میں بھی شاید جلدی لوٹ آؤں۔ ناشتہ کرنا، نہ بھولنا، ہیری۔ نہیں تو میں تمھیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔''

''بات سنو، رمیش۔ ایک منٹ اور ٹھہر جاؤ، بس دو گھونٹ ہی چائے رہ گئی ہے۔ گلاس اپنے ساتھ ہی لیتے جانا۔''

''بیٹھ کر آرام کے ساتھ چائے پیو۔ اتنی جلدی جلدی پی رہے ہو جیسے کوئی تمھارے پیچھے لگا ہو — تمھاری یہ عادت نہیں گئی۔''

''لاؤ پکڑاؤ گلاس''، اس نے گلاس میرے ہاتھ سے پکڑ لیا۔ چبوترے کی سیڑھیاں اتر کر وہ گلی میں گیا اور پھر رک گیا، ''لو تمھارے تایا جی آ رہے ہیں۔ کرفیو بہت تھوڑے عرصے کے لیے کھلا ہے — مجھے دیر ہو رہی ہے۔''

میں نے اپنے چبوترے پر ذرا آگے بڑھ کر دیکھا تایا جی دھیمی چال کے ساتھ آ رہے تھے۔ گزشتہ کچھ عرصے سے ان کے گھٹنوں میں درد رہنے لگا تھا۔ کنوئیں کے پاس پہنچ کر انھوں نے مجھے دیکھ لیا۔

''ٹھیک ٹھاک تو ہے نا، ہیری؟ باہر حالات خراب ہو گئے ہیں۔ میں بڑی مشکل سے آیا ہوں۔ تم نہا کر ہماری طرف آ جاؤ، پھر میں تمھیں ساری بات بتاؤں گا۔ جلدی آنا، زیادہ دیر نہ کرنا۔''

7

تھوڑی دیر بعد ہی میں سامنے سیڑھیاں چڑھ گیا۔ تایاجی نے چائے کا پانی گیس پر رکھا ہوا تھا۔ میرا انتظار ہو رہا تھا، مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔

"بہت بری حالت ہے، بیری، لوگ بہت بجڑ کے ہوئے ہیں۔ رات میں نے امرتسر کے اسٹیشن پر گزاری، کرفیو کھلتے ہی گھر لوٹ آیا ہوں۔"

"آپ کا مجھے کل شام سے ہی انتظار تھا۔ ٹیلی ویژن سینٹر سے تو آپ تین چار بجے فارغ ہو گئے ہوں گے؟"

"ہاں — لیکن اس وقت ادھر بسیں آنی بند ہو گئیں۔ اسٹیشن پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ گاڑیاں لیٹ تھیں۔ بڑی دیر انتظار کیا، آخر فلائنگ میل ملی، اس نے ساڑھے گیارہ بجے امرتسر پہنچایا۔"

"آپ نے، رات کو روٹی وغیرہ تو کھائی ہوگی؟ لیکن آپ کے اسٹیشن پر پہنچنے تک تو سب اسٹال بند ہو گئے ہوں گے۔"

"پھر بھی ایک اسٹال والے نے چائے بنا دی اور بھی کچھ مسافر تھے بس وہی چائے کا کپ پیا دو بسکٹ کھائے۔ ویٹنگ روم میں بیٹھ کر بڑی بے آرامی میں رات گزاری۔"

"بھوکے پیاسے نیند بھی تو نہیں آتی، تایاجی۔"

"سوتو میں نے جانا تھا لیکن دو تین وردی والے مجھے تنگ کرنے پر بضد تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کوئی نہ کوئی فضول بات کر دیتے تھے۔ یہ لوگ بڑے بے حس ہیں۔"

"وہ آپ سے کچھ بٹورنا چاہتے ہوں گے۔"

"کیا پتا؟ میں نے اس طرح کا کام نہ کبھی پہلے کیا ہے، نہ کروں گا۔ ویسے ایک

مارواڑی نے میری مدد کی۔''

''وہ کیسے —؟''

''پولس والے جب تیسری چوتھی مرتبہ فرسٹ کلاس کے ویٹنگ روم میں آئے تو وہ مارواڑی ان کے پیچھے پڑ گیا۔ وہ اس کے آگے نہیں بولے۔ اس کا گھرانہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ جھڑک کر بولا کہ ''کیوں بار بار اندر آتے ہو، وہ پھر نہیں آئے۔''

''تایاجی، دیکھنے میں آیا ہے کہ دوسرے صوبوں کے لوگ سکھوں کو نفرت نہیں کرتے، اگر نومبر چوراسی کے دنگوں کو ایک 'فینومنا' یا انوکھا واقعہ سمجھ لیں تو، لیکن یہاں پنجاب میں تو آپس میں کھٹ پٹ لگی ہی رہتی ہے۔''

میری بات سن کر تایاجی چپ ہوگئے۔ کچھ دیر سوچتے رہے۔ چائے کے دو تین گھونٹ بھرے، پھر وہ کھڑکی میں جا کھڑے ہوئے، تھوڑا سا کھانسے اور گلی میں تھوک کر واپس آگئے۔ کھڑکی انھوں نے کھلی ہی رہنے دی۔ چائے پیتے ہوئے میں نے کھڑکی میں سے اپنے پرانے گھر کی طرف دیکھا۔ اتنے میں تایاجی نے اپنے گلاس والی چائے ختم کردی۔ پھر انھوں نے ٹکٹکی باندھ کر میری طرف دیکھا —''

''دیکھو بیری، ذاتی طور پر کوئی بھی ہندو یا سکھ ایک دوسرے کو نفرت نہیں کرتے اور نہ ہی یہ بات کبھی مسلمانوں کے تئیں ہوئی تھی۔''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہو تایاجی؟ ابھی کل کی ہی بات ہے کہ پاکستان بنتے وقت مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں، سکھوں کے بلوے ہوئے۔ دونوں فرقوں نے ایک دوسرے کا کتنا خون خراب کیا۔''

''ٹھیک ہے تمھاری بات، بیری — لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ سارے لڑائی جھگڑے سیاست دانوں کے اپنی چودھراہٹ جمانے کے لیے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔''

''جب لوگ ان کے پیچھے لگ جاتے ہیں تو پھر وہ بھی اتنے ہی قصوروار ٹھہرے۔''

'یہ بھی تو ہے نا، بیری کہ ہمارا یہ ملک ناخواندگی کا گہوارہ ہے، جہالت کی منھ بولتی تصویر ہے۔''

''صرف اتنی ہی بات نہیں، تایا جی اور بھی کئی وجوہات ہیں — تاریخ کے اوراق، تہذیب کے زاویے، ثقافت کا تنوع۔ ہمارے خون میں یہ مخالفانہ جذبات جذب ہو چکے ہیں۔''

''یہ ہماری فطرت نہیں، بیری — وقتی ابال ہے، کوئی زمانہ تھا ہم لاہور کی گلیوں میں گاتے پھرتے تھے — 'خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے' اس وقت ہندو سکھ اور مسلمان ایک ہی اسٹیج سے تقریریں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ امرتسر میں رام نومی کے موقع پر ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں نے ایک ہی گلاس میں سے پانی پیا تھا۔''

''وہ دور سنہری دور ہوگا، تایا جی۔''

''ہاں — ان دنوں مولانا تاجور نجیب آبادی میرے ادبی رہبر تھے اور پنڈت میلا رام وفا میرے سیاسی رہنما۔''

''تایا جی اُن دنوں ہی سردار بھگت سنگھ نے 'ماں میرا رنگ دے بسنتی چولا' گاتے ہوئے پھانسی کا پھندہ چوما تھا۔''

''بیری، جیسے مرزا غالب نے کہا ہے۔ 'ہوا میں ہے شراب کی تاثیر' — ویسے ہی آزادی کے نغمے فضا میں تحلیل ہوئے تھے، جیلیں بھرنا ہماری نسل کا ایک شغل تھا۔''

''آپ بھی شاید جیل گئے تھے، تایا جی؟''

''نہیں، میں جیل تو نہیں گیا تھا، لیکن جیل جانے والی بات ہو چلی تھی، ہوا یوں کہ میری ایک نظم 'روزانہ کیسری' لاہور میں چھپی:

پہنچا ہوا ہے گاندھی و آزاد جیل میں
لے چل ہمیں بھی اے دلِ ناشاد جیل میں
جتنے ہیں ملک و قوم کے لیڈر وہ قید ہیں
اک دوسرا جہان ہے آباد جیل میں

اس کے بعد اسی اخبار میں ایک اور نظم چھپی:

نابھہ کے تاج و تخت سے محروم ہوگیا

تابہ نزلیش باعثِ عز و وقار پنتھ
تو نے منایا ان کی شہادت کے یوم کو
ننکانہ میں جو سنگھ ہوئے جاں سپار پنتھ

''کمال ہے تایاجی، ایک طرف جنگ آزادی کی بات، دوسری طرف پنتھ کی بات۔ اب تو یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے متضاد دکھائی دیتی ہیں۔''

''نہیں، نہیں — یہ بات نہیں، نہ اس وقت، نہ اب سکھ پنتھ نے جنگِ آزادی میں جو حصہ ڈالا ہے، وہ کسی اور نے نہیں ڈالا۔ میں تجھے ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ میری ایک نظم روزانہ 'درپن' لاہور کے 6دسمبر 1923 کے شمارے میں چھپی اور بعد میں جلیاں والے باغ کی اسٹیج پر یہ کئی مرتبہ پڑھی بھی گئی۔''

''وہ نظم کون سی تھی، تایاجی؟''

''اس وقت مجھے اس کا مقطع ہی یاد ہے:

وطن فروش نہیں ہم وطن پرست ہنر
نہ لیں بہشت بھی اپنے دیار کے بدلے

''خوب، بہت خوب — آپ اس وقت اٹھارہ انیس سال کی عمر میں اتنے پختہ شعر کہہ لیتے تھے۔''

''میں نے تمھیں بتایا ہے نا کہ یہ باتیں اس وقت ہر زبان پر تھیں۔''

''آپ کا جیل جانے کا ارمان پورا ہوا کہ نہیں؟''

''بس جیل ہو ہی چلی تھی، بیری۔ ان نظموں کی بدولت ملک سلیمان خان پی سی ایس نے میری گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیے۔ حسن اتفاق سے وہ بھی میری طرح مولانا تاجور کے شاگرد تھے۔ ہمیں پہلے خبر مل گئی۔ لاہور کے ایک کانگریسی لیڈر نے مجھے گیانی گورمکھ سنگھ مسافر کے نام ایک خط دیا۔ مسافر صاحب ان دنوں شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے سکریٹری تھے۔ انھوں نے مجھے گورورام داس سرائے میں ایک کمرہ لے کر دیا اور اس میں مجھے انڈر گراؤنڈ ہو جانے کے لیے کہا سو، ایک سال میں روپوش رہا۔''

''پھر تو آپ فریڈم فائٹر ہو گئے، تایا جی۔''

''لیکن میں نے کبھی بھی اس طرح کا دعویٰ نہیں کیا۔ بہت سے لوگوں نے مجھے کہا بھی کہ میں سیاسی پنشن کے لیے اپلائی کروں، لیکن میں کوئی سیاسی آدمی نہیں، شاعر ہوں، ادیب ہوں۔''

''اب دیکھو، ہمارے ملک کے سیاست دان کیا کڑھی گھول رہے ہیں۔ انھوں نے تو خیر سگالی کا جذبہ ہی ختم کر دیا ہے۔ وہ دن اب بہت دور نہیں، 'جب درد سے رک جائیں گی سب زیست کی راہیں' ہمارا تو اب آلودہ ماحول میں دم گھٹ رہا ہے۔''

ایک نظر تایا جی نے میری طرف دیکھا لیکن خاموش رہے۔ میں ان سے نظریں چرا کر کھلی کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگا۔ تھوڑی دور، کسی مکان کی چھت پر، ٹیلی ویژن کا انٹینا ٹوٹ کر ہوا میں جھول رہا تھا، وہ چاہے ٹوٹ چکا تھا لیکن تار کے ساتھ وہ اب بھی بندھا ہوا تھا۔ تیز ہوا میں وہ لٹک رہا ٹکڑا جب ہلتا تو میرا دل کرتا کہ وہ اچھل کر اپنے پہلے حصے کے ساتھ جا ملے۔ یہ بات سوچتے ہوئے میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یہ دنیا، یہ بے ترتیب دنیا، میری سوچ کے مطابق کی دنیا کیوں نہیں بن جاتی؟ لیکن یہ بات ممکن ظاہر ہو رہی نہیں تھی۔ اچانک مجھے تھکاوٹ محسوس ہوئی، بے حد تھکاوٹ۔''

''میں کچھ دیر کے لیے سونا چاہتا ہوں، رات میں اچھی طرح سو نہیں سکا تھا۔''

''ٹھیک ہے، تم یہیں سو جاؤ — میں یہ چیزیں یہاں سے ہٹا دیتا ہوں۔''

''نہیں، میں نیچے بھائیا جی کے کمرے میں جا کر سو جاتا ہوں۔''

''چلو، وہاں بھی ٹھیک ہے، اتنی دیر میں لنچ کے لیے کچھ تیار کرتا ہوں۔ اگر تم کہو تو تھوڑی دیر ٹھہر کر کیسر کے ڈھابے سے پراٹھے اور ماش کی دال منگوا لیتا ہوں۔''

''جیسے آپ کی مرضی، تایا جی۔ میرے لائق کوئی کام بتاؤ میں ویسے تو اس لحاظ سے بالکل نکما ہوں۔''

''بیری تم اس لحاظ سے فکر نہ کرو۔''

''تایا جی، آپ خود ہی اتنے بڑے گھر میں یہاں لگے ہوئے ہیں، آپ اپنے بیٹوں

کے پاس ممبئی بھی جا سکتے ہو اور دہلی بھی، وہ آپ کو آنے کے لیے کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں۔''

''یہ گھر بھی تو، بیری تنہا نہیں چھوڑا جاتا۔ کسی نہ کسی کا یہاں پر رہنا بہت ضروری ہے۔''

''گھر کے ساتھ محبت ہو جانا قدرتی بات ہے۔ پہلے گھر کے ساتھ موہ ہوتا ہے۔ پھر گلی کے ساتھ، پھر بازار کے ساتھ۔ بعد میں بندہ کہنے لگ جاتا ہے — یہ شہر میرا ہے، یہ ہمارا صوبہ ہے یہ دیش ہمارا ہے، مہان دیش۔''

''پیدائش سے لے کر موت تک انسان کسی نہ کسی موہ میں پھنسا رہتا ہے، شاید اسی کا نام زندگی ہے۔''

''لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں، تایا جی، جو یہاں کی چیزوں کو تو محبت کرتے ہیں لیکن زمین کے ساتھ نہیں جڑتے، یہاں کی مٹی کو قبول نہیں کرتے۔''

''تمھاری بات ٹھیک ہے، بیری۔ آہستہ آہستہ یہ لوگ اپنی مادری زبان کو بھی بھول جاتے ہیں، بلکہ اس کے ساتھ نفرت کرنے لگتے ہیں۔''

''اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے فیروزالدین شرف نے بہت خوب کہا ہے:

پچھی بات نہ جنھاں شرف میری
وے میں بولی آں اُہناں پنجابیاں دی

(اے شرف جن لوگوں نے میری کوئی قدر و منزلت نہیں کی میں انھیں پنجابیوں کی زبان ہوں)

بھایا جی کے کمرے میں جا کر مجھے بہت سکون حاصل ہوا۔ یہ کمرہ ابھی بھی ان کے نام کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ ویسے ان کی طرف سے اس زمین کو الوداع کہے ہوئے پچیس سال ہو چکے تھے۔ ایک زمانہ گزر چکا تھا لیکن ان کی یاد اب بھی ہمارے دلوں میں قائم تھی۔ بھایا جی یہاں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر چڑیاں دیکھا کرتے تھے، یا پھر موٹی موٹی کاپیوں میں لال سیاہی کے ساتھ لکھتے رہتے تھے۔ لگاتار، کئی کئی گھنٹے یا پھر چڑی پڑھتے وقت وہ کھڑکی میں کھڑے ہو جاتے تھے اور آنکھیں سکیڑ کر کتنی کتنی دیر اس کو پڑھتے رہتے تھے۔

ایک مرتبہ مجھے پوچھنے لگے — تجھے پتا ہے میں کیا لکھتا رہتا ہوں؟''

''نہیں، بھائیا جی''

''یہ علم نجوم ہے، سب سے بڑا علم، ہمیں سو سال بعد ہونے والی بات کا پتا چل جاتا ہے۔''

''یہ کیسے، بھائیا جی؟''

''ستاروں کی گردش کو دیکھ کر اس کائنات میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے، سیاروں کی چال کے مطابق ہو رہا ہے۔''

''اگر یہ بات ہے تو انسان کو ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا چاہیے۔ جو ہونا ہے وہ تو ہر حیلے ہو کر ہی رہتا ہے۔''

''نہیں بیری، یہ بات نہیں، انسان کا کام کرتے رہنا بھی ستاروں کی گردش کے مطابق ہی ہے، مجھے کبھی بے کار بیٹھے ہوئے دیکھا ہے؟''

''نہیں، بھائیا جی۔''

''اس لیے کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، کام میں مصروف رہا ہوں۔ بیکار تو میں بیٹھ ہی نہیں سکتا۔ تم بھی تو بہت پڑھتے رہتے ہو۔ تمھارے باؤ کو پڑھائی کا شوق نہیں تھا۔ جب اسکول جانے کا وقت ہوتا وہ کبھی کسی چبوترے پر چڑھ جاتا، کبھی کسی پر۔''

''پھر بھی وہ اپنے کاروبار میں اچھے رہے۔ بنارسی ساڑھیوں کی جتنی انھیں پرکھ ہے اور کسی کو نہیں۔''

''ہاں — لیکن اب تمھارے باؤ کی نظر بہت کمزور ہو گئی ہے۔ اس کو میں نے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ اپنی آنکھوں میں میرے والا سرمہ ڈالا کر، لیکن وہ اس بات کی طرف دھیان ہی نہیں دیتا۔ تجھے وہ سرمہ میں دوں گا۔''

''نہیں، بھائیا جی، سندھوری رنگ والا آپ کا سرمہ مجھے نہیں اچھا لگتا، کالے رنگ کا ہو تو ڈال لوں۔''

''کالے رنگ کا سرمہ تو ہر کوئی [illegible]

''اب تو کاجل ملتا نہیں، بھائیاجی۔''

''ہاں — اگر کڑوے تیل کے چراغ ہی نہیں رہے تو پھر کاجل کہاں سے آئے گا؟''

''اچھا، تم اب جاؤ، اپنا کام کرو، مجھے سونے دو۔''

''وہ کسی کو بھی اپنے پاس زیادہ دیر بیٹھنے نہیں دیتے تھے۔ ان کی دلچسپی گپیں ہانکنے کی بجائے، بندے کو کسی نہ کسی کام میں لگائے رکھنے کی تھی۔ علم نجوم وہ اپنے ساتھ ہی لے گئے۔ ان کے بعد وہ بڑی پوتھیاں کسی نے نہ سنبھالیں۔ مجھے وہ بات یاد تھی، بھائیاجی کے انتقال ہونے کے چند دن بعد تائی جی نے میرے آگے ایک ٹرنک رکھتے ہوئے کہا تھا — 'لے دیکھ لے بیری — اس میں تمھارے کام کی کوئی چیز ہو تو لے جاؤ۔'' میں نے اس ٹرنک کا ڈھکن کھولا۔ اس میں کچھ جنتریاں اور کچھ موٹی موٹی کاپیاں پڑی تھیں۔ میں نے انھیں الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ان میں ہمارے سنبھالنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ اچانک میرے ذہن میں مرزا غالب کا مصرع آیا:

بعد مرنے کے میرے گھر سے یہ ساماں نکلا

اب اس کمرے میں، تخت پوش پر لیٹے، پتا نہیں کیوں مجھے یہ باتیں یاد آرہی تھیں۔ ایک زمانہ بیت چکا تھا، دوسرا دور شروع ہوگیا تھا۔ وہاں پر پڑی ہوئی ہر چیز پر وقت کی گہری دھول جم چکی تھی۔ پھر بھی ناکلیں وہی تھیں، کھڑکیاں اور دروازے وہی تھے، سیلنگ فین وہی تھا۔ پھر میری نظر کلاک کی طرف گئی، کلاک بھی وہی تھا۔ اس وقت اس میں ساڑھے بارہ بجے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ نیند نہیں آرہی تھی۔ رات کو میں زیادہ تر جاگتا ہی رہا تھا، یا الٹے سیدھے خواب لیتا رہتا تھا۔ بھائیاجی نے بہت روپیہ کمایا تھا لیکن سنبھال کر نہ رکھا۔ یہ خیال آتے ہی میری نظر سامنے والی دیوار پر گئی۔ وہاں ناکوں میں لکشمی دیوی کی تصویر ابھری ہوئی تھی۔ کنول کے کھلے ہوئے پھول میں بیٹھی وہ دیوی بڑی دلکش لگ رہی تھی۔

''پیسے کی تمنا تو بری بات نہیں، بیری، لیکن اس کا لالچ نہیں ہونا چاہیے۔''

''بلکہ میرے دل میں تو اس کی تمنا ہی نہیں، بھائیاجی۔''

''اسی لیے تو تجھے کئی بار شرمندگی کا منہ دیکھنا پڑا، ہیری۔ کئی مرتبہ تجھے معمولی سے بندوں کے آگے ہاتھ پھیلانے پڑے ہیں۔ اس کے ساتھ تیری پوزیشن میں بھی فرق آیا ہے۔''

''زیادہ پیسے والے بندے کو گھمنڈ کیوں ہو جاتا ہے، بھائیا جی؟ جو چیز پیسے کے ساتھ خریدی جاسکتی ہے، اس پر تکبر کرنا اوچھی بات ہے۔''

''خالص لیاقت کو کون پوچھتا ہے، ہیری۔ ہاں اگر پیسہ ہو تو انسان کی لیاقت کی قدر بھی بڑھ جاتی ہے۔ اسی لیے میں نے علم نجوم کی طرف اس وقت دھیان دیا، جب میں یہ گھر بنا چکا تھا۔ لاہور رہتے ہوئے میں نے ضرورت کے مطابق روپیہ کما لیا تھا۔''

''آپ، کتنے سال لاہور رہے؟''

''اچھی طرح تو یاد نہیں، یوں سمجھ لو کہ تمھارا تایا وہاں پیدا ہوا تھا اور تمھارے بڑے چچا کی پیدائش کے بعد ہم اپنے گھر، امرتسر، لوٹ آئے۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ وہاں کم از کم بیس سال رہے۔ یہاں آکر علم نجوم کا شوق آپ کو سٹہ چیمبر کی طرف لے گیا — ٹھیک ہے نا میری بات، بھائیا جی۔''

''اصل میں میرے کچھ عقیدتمند مجھے مندہ تیزی کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے۔ اس طرح میرا بھی اس طرف دھیان ہو گیا۔ کمایا بھی بہت اور بہایا بھی بہت۔''

''آپ کے عقیدت مندوں کی لائن بہت لمبی ہے، بھائیا جی کہتے ہیں لاہور میں بھی آپ کی ایک عقیدتمند ہوتی تھی۔''

''وہاں —؟ ہاں، ہاں، ایک بیچاری تھی بڑے اچھے گھر کی روپیہ پیسہ بے حساب تھا ان کے پاس، لیکن ان کے گھر اولاد نہیں تھی۔ میں نے اپنی حکمت کے حساب سے اسے تین پڑیاں دیں، تینوں پون ماشیوں کو ایک ایک کر کے کھانے کے لیے۔ بس — پھر کیا تھا۔''

''بھائیا جی اس کے گھر بچہ ہو گیا؟''

''ہاں، سال کے اندر اندر لڑکا ہو گیا۔ اس کا شوہر خالی چیک لے کر میرے پاؤں

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

آپڑا۔"

"پھر تو بھائیا جی آپ نے اس میں بڑی رقم بھری ہوگی؟"

"نہیں، بیری — میں نے وہ چیک اسے واپس کر دیا اور کہا کہ یہ عطیہ تو پرماتما کا ہے۔"

"آپ کی یہ بات مجھے بہت دلچسپ لگی ہے، بھائیا جی۔"

"حقیقت ہمیشہ دلچسپ ہوتی ہے، بیری۔"

ضرور ہوتی ہوگی لیکن کئی مرتبہ حقیقت تلخ، کڑوی اور کسیلی بھی بہت ہو جاتی ہے۔ میں نے کروٹ لی۔ یونہی آدھے گھنٹے کے لیے نیند کا ایک جھپکا سا آ گیا۔ میرا ایک بازو میرے سر کے نیچے تھا۔ دوسرا بازو باہر نکال کر میں نے کروٹ لی اور دوسرا بازو نیچے رکھ لیا۔ میں وہاں بڑے آرام کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ باہر کرفیو لگا ہوا تھا۔ ڈر اور خوف کا ماحول قائم تھا۔ کسے کس سے ڈر تھا، کسے کس پر شک تھا، کسی کو پتا نہیں لگ رہا تھا۔ شاید یہ لوگ اپنے ہی سائے سے ڈر رہے تھے اور اپنی قابلیت پر انھیں شک تھا۔ جو کچھ بھی تھا بری بات تھی۔ سن سینتالیس میں یوں ہی ہوا تھا۔ کوئی مکار اپنی گھناؤنی چال چل گیا تھا۔ بھائیوں میں تفرقہ پڑ گیا تھا۔ اب پھر بڑی نفاست کے ساتھ ایک چال چلی جا رہی تھی۔ فرقہ پرست لوگ جانتے تھے کہ پہلے کیا ہوگا، پھر کیا ہوگا اور آخر میں کیا ہوگا۔ یہ آدم زاد وحشی گپھاؤں میں سے نکل کر گلیوں، بازاروں میں پھیل گئے تھے۔ اندھیری اور سیلی گپھاؤں کے یہ باشندے کوئی بڑی شرارت آمیز چال چلنے کی تیاری میں تھے۔ پھولوں میں سے پھول، یہ گلاب کا پھول اب مرجھا گیا تھا، اس کی پتیاں مرجھا گئی تھیں۔

"نہیں، نہیں بیری — اتنی جلدی حوصلہ نہیں ہارتے۔ وقت کی لہریں ایک دوسرے کو تھپیڑ تو مارتی ہیں لیکن جلدی ہی یہ پھر ایک ہو جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ روانی میں کچھ فرق تو ضرور پڑتا ہے، لیکن جلد ہی یہ اپنا راستہ تلاش کر لیتی ہیں۔"

"بھائیا جی آپ نے اپنی زندگی میں کبھی بھی حوصلہ نہیں ہارا تھا؟"

"ضرور ہارا ہوگا، لیکن تھوڑی دیر کے لیے۔ میرا جگری دوست لالہ منی لال جب

لاہور سے اجڑ کر ہمارے گھر یہاں آ گیا تھا، تو ایک مرتبہ تو میری آہ نکل گئی تھی۔ وہاں کناری بازار میں ہماری دکان کے ساتھ ہی اس کی دکان تھی۔ ہمارا بناری ساڑھیوں کا کام تھا۔ اچھی آمدنی تھی۔ رات ہی رات میں اس کی امارت ناداری میں بدل گئی تھی۔''

''اب آج کل کہاں ہے؟''

''ہمارے پاس کچھ دن رہ کر وہ امرتسر سے دہلی چلا گیا تھا۔ وہاں بھی کناری بازار میں اس نے دکان لے لی، کام چل پڑا، لیکن وہ دیش کی تقسیم کا صدمہ برداشت نہ کر سکا۔''

''لالہ جی کی ایک لڑکی بھی تھی، گوری چٹی، مجھے اس کی چوٹی پکڑنے کا بہت شوق تھا۔''

'وہ منی لال کی پوتی تھی، بیری، لڑکی نہیں، بڑا اچھا تھا اس کا نام — ''

''پشپا — ''

''ہاں، ہاں — تو کہا کرتا تھا پشپا تجھے بہت اچھی لگتی ہے۔''

''میں نہیں تھا کہا کرتا، بھایا جی، بلکہ وہ کہا کرتی تھی کہ بیری اس کو بہت اچھا لگتا ہے۔''

''چلو ایک ہی بات ہے — مطلب تو اچھا لگنے سے ہے۔''

آنکھیں ملتا ہوا میں تخت پوش سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر میں اوپری سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ آخری سیڑھی پر جب میں نے پاؤں رکھا تو گھڑی میں دو بج رہے تھے۔ کافی وقت میں نیچے گزار آیا تھا۔ مجھے بیٹھک میں جاتا دیکھ کر تایا جی ایک ہاتھ میں پوریوں والی پلیٹ اور دوسرے میں سبزی والا ڈونگہ لے کر رسوئی سے آ گئے۔

''تایا جی، آپ نے تو آج بڑی زحمت کی ہے۔''

''نہیں، نہیں''، تایا جی نے وہ دونوں چیزیں ٹیبل پر رکھ دیں، ''زحمت میں نے نہیں کی، تمھارے دوست رمیش کے گھر والوں نے کی ہے۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے حیرانی کے ساتھ پوچھا۔

''بس آدھا گھنٹہ پہلے رمیش کا لڑکا یہ چیزیں خود بخود یہاں رکھ گیا۔ میں نے اس کو آواز دی لیکن اس نے پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا، کیا کرتا میں؟ اوپر سے مکھ کی سلاخوں سے میں نے جھانک کر دیکھا لیکن تم گہری نیند میں سوئے ہوئے تھے۔''

یہ بات کہتے ہوئے تایا جی پانی کے دو گلاس لے کر آگئے۔ مجھے پھر خیال آیا کہ میں کام کرنے میں کتنا سست تھا۔ کھانا کھا کر میں کوٹھے پر چلا گیا۔ وہاں دو چار چکر کاٹے۔ پورے کوٹھے پر دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ دیر میں مٹی کے نیچے کھڑا رہا۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اپنے کوٹھے پر کوئی بھی نہیں تھا۔ چاروں طرف خاموشی تھی، جیسے ماحول کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ باہر کرفیو نافذ تھا اور لوگ اپنے گھروں میں قید تھے۔ کسی کو اس بات کا پتا ہی نہیں تھا کہ آیا ہم کھانا کھا چکے تھے یا بھوکے تھے۔ تھوڑی دیر بعد میں نیچے اتر آیا۔ تایا جی لیٹے ہوئے تھے۔ میں کرسی پر بیٹھ کر ایک رسالہ پڑھنے لگا۔ اردو شاعری میں میری دلچسپی ابھی بھی قائم تھی۔ میں نے کچھ غزلیں پڑھیں۔ ایک کہانی بھی میری نظروں سے گزری۔ گزرا وقت یاد آگیا، جب میں گھنٹوں کتابیں اور رسالے پڑھتا رہتا تھا۔ اب میرے پاس اتنی فرصت نہیں تھی۔

کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی میں نے آنکھیں موند لیں۔ میں سونا نہیں چاہتا تھا، یہ کام میں کھانا کھانے سے پہلے کر لیا تھا۔ صرف کچھ دیر کے لیے میں اپنے ذہن کو خالی رکھنا چاہتا تھا۔ ذہن خالی رکھنے کے لیے بھی خاص کوشش کرنی ضروری تھی۔ کچھ لمحوں کے لیے میرا خالی ذہن خلا کے ساتھ جڑ گیا۔

8

شام کی چائے پی کر میں پھر مکان کی چھت پر چلا گیا۔ سورج اب سیتلا مندر کی طرف کھسکتا جا رہا تھا۔ وہاں سے اس نے اور دور خالصہ کالج کی جانب چلے جانا تھا۔ پھر اس نے لاہور کی سمت میں کہیں روپوش ہو جانا تھا۔ جب بھی آسمان پر بادل چھا جاتے تو بھایا جی پوچھتے ''کس طرف سے آیا ہے، بادل؟ اگر ہم میں سے کوئی کہہ دیتا کہ لاہور کی جانب سے، تو پھر ان کا جواب ہوتا،''تو پھر بہت بارش ہوگی۔'' ان کی بات ہمیشہ سچ ثابت ہوتی۔ اب بھی جب ادھر کی جانب سے گھٹا اٹھتی ہے تو ہمارے گھر کے سب افراد کو پتا ہوتا ہے کہ بارش جم کر ہوگی۔ وہاں کھڑا میں کچھ دیر لاہور کی طرف دیکھتا رہا۔ ادھر کوئی بادل نظر نہیں آرہا تھا۔ پھر میری نظر گوبند گڑھ کے قلعے پر مرکوز ہوگئی۔ اس قلعے کی گراؤنڈ میں اپنے دوستوں کے ساتھ ہزار مرتبہ گیا تھا۔

اس وقت دوسری بڑی جنگ لگی ہوئی تھی۔ وہاں بڑا سخت پہرہ ہوتا تھا۔ کافی یہاں تک کانٹوں والی تار لگی ہوئی تھی۔ شام کے وقت بھایا جی ہمیں کہتے،''جاؤ جاکر قلعہ کی پریڈ گراؤنڈ میں تلچولی ڈال آؤ۔'' ہم گھر کے دو تین لڑکے پوٹلی پکڑ کر پریڈ گراؤنڈ میں چلے جاتے اور بڑے دھیان کے ساتھ کیڑوں کا بھون تلاش کرتے۔ کئی مرتبہ بھون تلاش کرتے کرتے کانٹوں والی تار کے پاس پہنچ جاتے۔ دور کھڑا سنتری پہلے ہمیں گھورتا، پھر بلند آواز میں پوچھتا،''کون ہو تم؟'' ہم میں سے کوئی جواب دیتا''جی ہم اسکول میں پڑھتے ہیں۔'' وہ غصہ میں کہتا، وہ بات تو ٹھیک ہے لیکن یہاں کیا کر رہے ہو؟ ہماری طرف سے جواب ہوتا، 'جی کیڑوں کے بھون پر تلچولی ڈال رہے ہیں۔ وہ تھوڑا آگے آکر، سنگین کو ہماری طرف جھکا کر، دہاڑتا، دوڑ جاؤ یہاں سے، ورنہ قید کر لیے جاؤ گے۔''

جلدی جلدی تنکچولی کیڑوں کے سوراخوں پر ڈال کر ہم سڑک کی طرف بھاگ جاتے۔ کئی مرتبہ ہمارے پیچھے ہی آواز آتی 'ہالٹ دوڑو نہیں، آرام سے جاؤ، ہم پہلے رکتے پھر آہستہ آہستہ چلنے لگتے۔ کبھی کبھی اس وقت بگل کی آواز آتی۔ ہم پیچھے کی جانب دیکھتے، قلعے کے گیٹ کی اوپری فصیل پر کھڑا ایک فوجی بگل بجا رہا ہوتا۔ دوسری طرف یونین جیک کو آہستہ آہستہ نیچے کھسکایا جاتا۔ جھنڈا اترنے کے بعد بھی کچھ دیر بگل بجتا رہتا۔ اس وقت شام گہری ہو چکی ہوتی۔ گھر پہنچتے پہنچتے ہمیں کافی دیر ہو جاتی۔ کئی مرتبہ ہمیں گھر کا کوئی بندہ راستے میں ہی مل جاتا، تم کہاں تھے؟ گھر چلو، تمھاری پٹائی ہوگی، تنکچولی ڈالنے گئے تھے یا پریڈ کرنے؟

پھر وہ دن بھی آیا جب یہاں یونین جیک کی جگہ ترنگا لہرایا۔ اس دن لوگوں کو پریڈ گراؤنڈ میں ہی نہیں بلکہ قلعے کے اندر جانے کی بھی چھوٹ تھی۔ میں اپنے دو تین ساتھیوں کے ساتھ اندرونی کمروں میں گھومتا رہا۔ پرانی طرز کے بڑے بڑے کمرے، اینٹوں کے فرش، اونچی چھتیں، گہرے روشن دان — یوں دکھائی دیتا تھا جیسے یہ کمرے فوجیوں کے رہنے کے لیے نہیں، بلکہ قیدیوں کو ان میں بھرنے کے لیے بنائے گئے ہوں۔ خندق سوکھی ہوئی تھی۔ اندر کی بجائے ہمیں قلعے کا بیرونی رعب و دبدبہ زیادہ متاثر کن لگا۔ جلدی ہی ہم قلعے کی خندق پر بنے پل پر سے گزر کر باہر آ گئے۔ باہر بہت رونق تھی۔ آزادی حاصل کر لینے کا احساس سب کے دلوں میں تھا۔ آہستہ آہستہ میرے باقی ساتھی اِدھر اُدھر چلے گئے، صرف راجکماری میرے ساتھ رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں سیتلا مندر کے سامنے والی سڑک سے کچھ فاصلے پر بنی ہوئی دیوار پر بیٹھ گئے۔ شہر والوں کے لیے یہ سیتلا مندر ہی تھا، اگرچہ باہر سے آنے والے یاتری اسے زیادہ تر درگیانہ مندر ہی کہتے تھے۔ اس اونچی دیوار پر بیٹھنے کا ہمارا مقصد گنے چوسنا تھا۔ راہ چلتے ہوئے ہم نے گنے لے لیے تھے اور یہاں بیٹھ کر انھیں چوسنا چاہتے تھے۔ گنے چوستے ہوئے ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر ہماری نظر کے سامنے مندر کے سرودر میں نہارہے لوگوں پر پڑی۔ ہم بھی وہاں کئی مرتبہ نہا چکے تھے۔ ہوتا یوں تھا

کہ پرکرما میں، ایک جانب کھلی جگہ پر، ہماری شاکھا لگا کرتی تھی۔ ہم پندرہ بیس ہندو کالج کے طالب علم پہلے وہاں کبڈی کھیلتے۔ پھر کھوکھو اور آخر میں کوئی اور کھیل۔ پرارتھنا کرنے کے بعد ہم تالاب میں کود جاتے۔ وہاں سے گزرتے دھرماتما لوگ ہمیں گھورتے لیکن کہتے کچھ نہیں تھے۔ میرے کچھ ساتھی نہاتے ہوئے غوطہ لگانے کی کوشش کرتے لیکن میں ہمیشہ بچ جاتا۔ دراصل اس ٹولی میں میں اکیلا سکھ لڑکا ہوتا تھا۔ کسی نہ کسی بہانے وہ میرا جوڑا بھگونا چاہتے تھے، کچھ دیر اس طرح کی ہی خرمستی ہوتی رہتی۔ پھر ہم سرودر میں سے باہر آجاتے۔ اپنی لنگوٹیاں نچوڑ کر نیکریں پہن لیتے۔

''یاد ہے نا، ذرا جھکار، نیکر پہننے والا کام ہمیں بڑی چستی کے ساتھ کرنا پڑتا تھا۔ جلدی میں کئی مرتبہ لنگوٹی کا ایک سرا نیکر میں ہی پھنس جاتا اور بٹن بند ہو جاتا۔''

''اوما اور ستی بڑے شرارتی تھے۔ خود تو وہ ایک دوسرے کے آگے پیچھے ہو کر کپڑے بدل لیتے لیکن دوسروں کے اردگرد ہو جاتے۔''

''کئی مرتبہ تو وہ بلرام وغیرہ سے جھڑکیاں بھی کھاتے لیکن وہ بہت ڈھیٹ تھے۔''

''تجھے یاد ہوگا، بلبیر، ایک مرتبہ ہمارے گھٹنا ٹیک شام لال نے ان کی نیکریں سرودر میں پھینک دی تھیں۔ اس وقت اگر ہردیو پرکاش جی ادھر نہ آجاتے تو بات بہت آگے بڑھ جاتی۔''

باتیں کرتے ہوئے ہم گنے چوستے رہے۔ یہ باتیں ابھی بمشکل کوئی ایک سال پرانی تھیں۔ اس وقت ہم ایف اے کے سال دوم میں پڑھتے تھے۔ تقسیم کے بعد تو جیسے ہماری دنیا ہی بدل گئی تھی؟ ہم اپنے آپ کو لڑکپن کی سطح سے اوپر اٹھے سمجھتے تھے۔ خرمستیاں بند، نظریں نیچی، ناک کی سیدھ چلنا، یہ باتیں میں نے اپنے باؤجی سے سیکھی تھیں۔ گلی میں سے گزرتے ہوئے کسی ڈیوڑھی میں جھانکنا نہیں، اوپر کسی چھجے کی طرف آنکھیں اٹھا کر نہیں دیکھنا، کنوئیں پر جب عورتیں کپڑے دھو رہی ہوں تو دوسری طرف منہ پھیر کر گزرنا۔ ویسے کوٹھے پر چڑھ کر چاروں طرف دیکھنے کی چھوٹ تھی۔ کوٹھے کے چار چار چکر لگا کر نیچے بیٹھک میں پڑھنے بیٹھ جانا یہ معمول بن چکا تھا۔

اب پھر میں تایا جی کے کوٹھے پر چکر کاٹ رہا تھا۔ وقت بدل چکا تھا، جذبات بدل چکے تھے، خیالات بدل رہے تھے۔ اس وقت گھروں کی چھتوں سے کودتے ہوئے ہم ایک گلی میں سے دوسری گلی میں پہنچ جاتے تھے۔ یہاں تک کہ کسی کے کوٹھے پر بغیر کسی سے پوچھے، سیڑھیوں کے ذریعے گلی میں اتر جانا معمولی بات تھی۔ گرمیوں کے دنوں میں، دوپہر کے وقت ڈیوڑھیوں میں عورتیں اور بچے سوئے ہوتے تھے۔ اس وقت، اپنے پیروں کو ان کی ٹانگوں اور بانہوں سے بچاتے ہوئے ہم ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر گلی میں دوڑ جاتے۔

''راجکمار، تمھارے پڑوس والی وہ لڑکی بہت خوبصورت ہوتی تھی۔'' گنے کی آخری پوری چوستے ہوئے میں نے انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم بھی تو ہمارے چھجے سے ان کے چھجے کی طرف لٹکا ہی رہتا تھا۔'' اس نے رس کا بڑا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

''میں نے کبھی اس کی طرف خاص دھیان نہیں دیا تھا۔ جب کبھی انگریزی کے کسی مشکل لفظ کا اس نے مجھ سے مطلب پوچھنا ہوتا تھا وہ پوچھ لیتی تھی۔ اس سے زیادہ تو ہماری کوئی بات نہیں ہوتی تھی'' میں نے ذرا جھینپتے ہوئے اس کو جواب دیا۔

''یری، میں بھی تو ساری شام اس چھجے پر ہی بیٹھ کر پڑھتا رہتا تھا، مجھے تو وہ کسی مشکل لفظ کا مطلب بتانے کے لیے نہیں کہتی تھی۔'' راجکمار نے گنے کی آخری پوری کو دور پھینکتے ہوئے کہا۔

''یہ تو اپنی اپنی لیاقت کا اثر ہے، پیارے، ویسے تو تم بھی ہماری گلی میں کم چکر نہیں لگاتے تھے۔'' میں اپنے گنے کی آخری گنڈیری چوس رہا تھا۔

''وہ جو تمھارے گھر سے کنوئیں کی جانب چلبلی سی رہتی تھی نا، وہ مجھے دیکھ کر ہنستی ہوئی اپنی ڈیوڑھی میں داخل ہوجاتی تھی۔ پھر جب میں تمھارے گھر سے ہوکر واپس آتا تو وہ پھر اپنے چبوترے پر کھڑی ہوتی۔'' راجکمار پرانی باتوں کے جنگل میں کھو گیا تھا۔

''وہ لڑکی تو غل غپاڑوں کے بعد اپنے ننھیال بنارس چلی گئی تھی۔ پتا لگا ہے کہ اب اس کی شادی ہونے والی ہے۔'' گنڈیری کا چھلکا میں نے اپنے منہ سے نکال دیا۔

"ان سب کی شادی بیری —ایک ایک کرکے ہوجاتی ہے۔ ان کو مزے لینے دو، اپنی کلیاں تو کتابوں کے ذریعے ہی ہوتا ہے — انگلش پوئٹری، اکنامکس، ہسٹری یا پھر پولٹیکل سائنس۔ تم فارسی کے شعر پڑھتے رہا کرو، میں فرنچ پوئٹری سمجھنے کی کوشش کرتا رہوں۔" اتنا کہہ کر اس نے دیوار سے چھلانگ لگادی۔

"تم نے تو راج، وہ مضامین بھی گنوادیے۔ جو ہم نے ایف اے میں پڑھے تھے۔"
میں بھی اس کے بعد دیوار سے نیچے اتر آیا۔

"وہ کون سے ہمارے حلق سے اتر گئے ہیں، ابھی بھی دماغ میں گھوم رہے ہیں"، وہ تھوڑا میرے آگے آگے چلنے لگا۔

میرے دماغ میں اس طرح یہ سب باتیں گھوم رہی تھیں۔ تایاجی نیچے بیٹھے ہوئے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے یا پھر غزل لکھ رہے تھے۔ وہ کبھی بیکار نہیں بیٹھتے تھے۔ کوٹھے پر پھرتے ہوئے میں نے پچھواڑے کی طرف جھانک کر دیکھا۔ وہاں اب نئے مکان تعمیر ہوگئے تھے۔ پہلے یہاں مسلمانوں کے گھر ہوتے تھے۔ تقسیم کے بعد پہلے ان خالی مکانوں کو پہلے لوٹا گیا، پھر ان کو جلادیا گیا۔ یہ پرانی باتیں تھیں، جیسے بیتے زمانے کی ہوں۔ لوگ سب کچھ بھول چکے تھے۔ اب تو نئی نسل وجود میں آچکی تھی۔

اتنے میں دربار صاحب کی جانب سے کیرتن کا سنگیت فضا میں ابھرا۔ میری نظریں ادھر ہوگئیں۔ ہرمندر صاحب کو بُرجیاں تو وہاں سے نظر نہیں آرہی تھیں۔ لیکن بابا اٹل کا مینار دکھائی دے رہا تھا۔ یا پھر گورو کے محل والا گوردوارہ میری نظروں کے سامنے تھا۔ آہستہ آہستہ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ کہیں کہیں کوئی بتی روشن ہوچکی تھی۔ اس جھٹپٹا میں مجھے اپنا وجود کھویا ہوا محسوس ہوا۔ ہرمندر صاحب میں اس وقت کیرتن کا عمل جاری تھا۔ اُدھر سیتلا مندر کی طرف سے آرتی کی آواز آنے لگی۔ میرے اردگرد روحانی قسم کا ماحول بن گیا۔ سب کچھ مجھے خوشگوار اور خوشنما دکھائی دینے لگا۔ آسمان پر کچھ ستارے جگمگا رہے تھے۔ آس پڑوس کے گھروں میں سے لوگوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ کوئی وقت تھا جب ہاتھی گیٹ والی مسجد میں سے اذان کی آواز آیا کرتی تھی۔ اس مسجد کے گیٹ پر فارسی

میں لکھا ہوا تھا:

روز محشر کہ جانگداز بود
اولین پرسش نماز بود

یعنی قیامت کے دن جو کہ جان کو پگھلا دینے والا ہوگا، اس وقت سب سے پہلے نماز کے بارے ہی پوچھا جائے گا۔ اس نماز کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا تھا:

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

یا پھر اسی شاعر نے کسی اور انداز میں کہا تھا:

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

اس وقت مجھے تو یوں لگ رہا تھا کہ جتنی دیر بندہ صنم آشنا نہ ہو، اسے نماز پڑھنی ہی نہیں چاہیے۔ وہی دل رب کی بندگی کرسکتا تھا جو صنم کی محبت کو بھی تسلیم کرتا ہو۔ یوں تو سخت سے سخت دل میں بھی نزاکت داخل ہوجاتی ہے۔ انسانی پیار کے ساتھ ہی ربی پیار کی جوت دل میں جلتی ہے۔ خدا کے نام پر جب کوئی ظلم ڈھاتا ہے تو کائنات کانپنے لگتی ہے۔ کسی مذہبی گرنتھ میں، ظلم ڈھانے کا ذکر ہی نہیں، پھر جیسے مرزا غالب پوچھتے ہیں۔ ''پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے۔''

''بیری، یہاں اندھیرے میں بیٹھا ہے — بتی روشن کرلینی تھی''، تایاجی نے چائے کا پیالہ مجھے تھما کر بتی روشن کردی۔

''ادھر ادھر کی باتیں سوچتے ہوئے، اس بات کا خیال ہی نہیں آیا''، میں نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

''اگلے ناول کا کوئی پلاٹ سوچ رہا تھا؟ وہ میرے پاس ہی روش پر بیٹھ گئے۔''

''نہیں، اس طرح کی کوئی بات نہیں — آپ نے کوئی نئی چیز لکھی ہو تو سنانے کی زحمت کیجیے''، میری نظر ان کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے کاغذ پر تھی۔

''تھوڑی دیر پہلے دو چار شعر موزوں ہوئے ہیں'' تایا جی مسکرائے۔
''ارشاد — !'' میں رونس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔
''مطلع ہے — ''انھوں نے پہلا شعر پڑھنا شروع کیا:

آئینے سے اور کیا مانگوں
میں صرف اپنا چہرہ مانگوں

اگلا شعر ہے:

بڑھنے لگی ہے راہ کی ظلمت
آتشِ دل سے شعلہ مانگوں

ایک اور شعر سنو:

زہر آلود آواز ہے سب کی
کس سے شگفتہ لہجہ مانگوں

''بات تو شگفتہ لہجے ہی کی ہے، تایا جی''، میں پھر اپنے خیالوں میں گم ہوتا جا رہا تھا۔
''پتا نہیں یہ تلخی ہمارے لہجے میں کہاں سے آگئی ہے''، انھوں نے دور خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔

باتوں باتوں میں مجھے یوں لگا جیسے نفرت کا سمندر میرے اردگرد پھیلتا جا رہا تھا۔ اسی طرح کا سمندر پار کر کے میں، ملکی تقسیم سے دو مہینے پہلے، اپنے ننھیال ترنتارن پہنچ گیا تھا۔

ترنتارن پہنچا تو وہاں کا ماحول دیکھ کر میرے دل کو سکون ملا۔ وہاں بھی ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں میں کوئی کشیدگی نہیں تھی۔ بہت لوگ پہلے ہی کی طرح رہ رہے تھے۔ اتنا ضرور تھا کہ وہ لوگ امرتسر اور لاہور کی خبریں سن سن کر خوف زدہ تھے۔ سب کا یہی خیال تھا کہ جب فرقہ پرستی کا یہ بھوت لیڈروں کے سروں سے اترے گا تب حالات سازگار ہو جائیں گے۔ نانا جی کی دکان پر پہلے ہی کی طرح دو مسلمان لڑکے کام کر رہے تھے۔ بڑے لڑکے جمال دین کا کام صبح نانا جی کے ساتھ سبزی منڈی جانا اور وہاں سے سبزیاں لے کر دکان پر پہنچانا تھا۔ اس وقفے میں چھوٹا لڑکا، خرما، دکان کھول کر رکھتا تھا۔ کبھی کبھی جمال دین سبزیاں اور پھل لینے کے لیے امرتسر کی بڑی سبزی منڈی چلا جاتا۔ خرما ہمیشہ دکان پر رہتا۔ وہ میری عمر کا تھا — گورا چٹا، بھورے بالوں والا اور چندھی آنکھوں والا۔ اسکول میں جب گرمی کی چھٹیاں ہوتیں تو میں تین چار ہفتے ترنتارن قیام کر آتا۔ وہاں میرا سارا دن نانا جی کی دکان پر گزرتا۔

وہ دکان اصل میں دوہٹہ تھی۔ (دو دکانوں پر مشتمل)۔ ایک حصے میں، سبزیاں اور پھلوں کی چھت تک لگی ٹوکریوں کے درمیان، نانا جی گدی پر بیٹھے رہتے۔ ان کے آگے بھی ایک بڑا سا چھابہ ہوتا جس میں کبھی مٹر رکھے ہوتے، کبھی مولیاں اور کبھی آلو یا پیاز۔ اس حصے میں ان کی سلطنت تھی اور دوسرے حصے میں جمال اور خرما بیٹھتے تھے۔ دوہٹہ کا یہ حصہ کھلے کمرے جیسا تھا جس میں زیادہ تر پھلوں کی ٹوکریاں اور پٹو بھرے ہوتے یا پھر تھوڑا پیچھے ہونے کی وجہ سے پیاز اور آلوؤں کا سٹاک ہوتا۔ ادھر لکڑی کی موٹی سی دہلیز پر بھی خرما اور میں بیٹھے ہوتے۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر جمال دین بھی وہاں آ بیٹھتا یا دہلیز کے اندر

دو بوریاں بچھا کر لیٹ جاتا۔ اس کے ذمے بہت کام ہوتے تھے۔ اس لیے اس کے پاس ہمارے ساتھ باتیں کرنے کے لیے فالتو وقت نہیں ہوتا تھا۔ اس کے ذمے تھا پہلے سبزی منڈی جانا، پھر کھیتوں میں چکر لگانا، شام کو سبزی کی ریڑھی لگانا۔ ریڑھی لگا کر شہر کی گلیوں میں چلا جاتا اور چراغاں ہونے سے پہلے ریڑھی خالی کر کے واپس آ جاتا۔ وہ بال بچے والا تھا اور بوڑھے ماں باپ کی خدمت بھی اسی کے ذمے تھی۔ شاید اسی لیے نانا جی تنخواہ بھی اسے اچھی دیتے تھے اور وقتاً فوقتاً اس کی مالی مدد بھی کرتے رہتے تھے۔ سنجیدہ طبیعت کا ہونے کی وجہ سے وہ بہت دھیمی آواز کے ساتھ بات چیت کرتا تھا۔ بس میں ہی کبھی کبھی اسے باتوں میں لگا لیتا۔

خرما میرا دوست تھا، ہم دونوں دکان کی دہلیز پر بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ جب کبھی نانا جی کی آواز آتی — پیاز پکڑاؤ اوے، خرمیا — تو وہ دوڑ کر دکان کے اندر داخل ہو جاتا اور پیاز کی ٹوکری بھر کر اندر سے لے آتا۔ نانا جی گدی پر سے اٹھ کر اس سے پیاز پکڑ لیتے اور پیاز والے چھابے میں ڈھیری کر دیتے۔ کبھی کبھی خرمے کی جگہ میں پیاز یا آلوؤں کی ٹوکری بھر کر باہر لے آتا۔ مجھ سے ٹوکری پکڑتے ہوئے وہ پوچھتے — ''خرما کہاں گیا ہے؟' میں انھیں جواب دیتا — 'کہیں نہیں جی، یہیں ہے۔' تو پھر وہ تھوڑی بلند آواز میں کہتے، ''ارے خرمیا، باہر آ کر سبزی پر پانی چھڑک۔'' وہ یہ بات پسند نہیں کرتے تھے کہ میں یوں ٹوکری بھر کر انھیں پکڑاؤں۔ پھر بھی، اس بات پر وہ خرمے کو جھڑکتے بھی نہیں تھے۔ بس، طریقے کے ساتھ سمجھا دیتے۔ اسی لیے میں جب بھی ٹوکری بھرنے کے لیے اٹھتا تو خرما مجھے روک دیتا، 'نہیں، بھائی آپ رہنے دو یہ کام میں خود کر لوں گا۔ آپ اپنی کتاب پڑھو۔' کوئی نہ کوئی کتاب تو ہمیشہ میرے پاس ہوتی ہی تھی، لیکن اسے پڑھنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اگر کبھی ملتا بھی تو میرا پڑھنے کو دل چاہتا۔

گپوں کا شوقین ہونے کی وجہ سے خرما میرا دل بہلائے رکھتا۔ کبھی کبھی نانا جی آپ امرتسر پھل خریدنے کے لیے چلے جاتے تب جمال دین دکان پر بیٹھتا۔ اس دن میں اور خرما بڑی خرمستیاں کرتے، سارا دن بھنگڑو ڈالتے ٹنڈوں والے کنوئیں سے نہ چاہتے

ہوئے بھی پانی لینے چلے جاتے۔ ہٹی کے بالکل سامنے سول ہسپتال کے اندر، ٹنڈوں والا
کنواں تھا۔ پانی لینے کے لیے وہاں جاتے تھے۔ ایک بڑا سا ٹب اٹھا کر خرما کنویں کی
طرف چل پڑتا۔ کنوئیں کے پاس پہنچ کر میں اسے چلانے لگ جاتا۔ ٹنڈوں کی مالا حرکت
میں آجاتی اور ساتھ ہی کتا ٹک ٹک کرنے لگ جاتا۔ سچ مچ کتے کی طرح ہی بھونکتا تھا، وہ
چھوٹا سا لوہے کا اوزار — ایک سار، لگاتار۔ جب کنواں چلنے سے بند ہوجاتا تو یہ بھی
خاموش ہوجاتا۔ اگر اسے اوپر اٹھا دیا جائے تو کنوئیں کے الٹے چلنے کا ڈر تھا۔ ہمیشہ میری
یہی کوشش ہوتی کہ کنوئیں کو میں ہی چلاؤں۔ کبھی کبھی ہم دونوں اس بات پر لڑ جھگڑ
پڑتے۔ یوں شیخی شیخی میں ہماری کشتی ہوجاتی۔ کنوئیں کے پاس ہی گھاس والی جگہ پر ہم
گتھم گتھا ہوجاتے۔ کبھی میں اسے چت کر دیتا کبھی وہ مجھے۔

کشتی لڑتے لڑتے جب ہم تھک جاتے تو کنوئیں کی حوض میں ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ
جاتے اور ہاتھ منھ دھونے لگتے۔ پھر ہنستے ہوئے ہم ٹب کو دونوں کنڈوں سے پکڑ لیتے اور
دکان کی طرف چل پڑتے۔ وہ اچھا خاصا ٹب تھا اور گہرا بھی بہت تھا۔ ایک نے دائیں
ہاتھ کے ساتھ ایک کنڈا پکڑا ہوتا اور دوسرے نے بائیں ہاتھ کے ساتھ دوسرا کنڈا۔ کبھی
کبھی پانی ٹب میں اچھلتا اور ہماری ننگی ٹانگوں پر پڑتا۔ عام طور پر میں نے نیکر پہنی ہوتی
تھی اور خرمے نے اپنے پاجامے کو دوہرا کر کے اپنی کمر کے ساتھ لپیٹا ہوتا۔ پھولی ہوئی
سانس کے ساتھ ہم دکان پر پہنچتے اور ٹب کو جھٹکے کے ساتھ چبوترے پر رکھ دیتے۔ سانس
لینے کے لیے میں دہلیز پر بیٹھ جاتا اور چڑیا کے بوٹ کی مانند منھ کھول کر ہانپتا۔ خرمے کی
سانس پکی ہوئی تھی۔ اس لیے آتے ہی وہ سبزیاں دھونے لگ جاتا یا ڈبے بھر بھر کر
سبزیوں کے چھابوں پر چھڑکنے لگتا۔ اصل میں پانی کا ٹب کنوئیں سے بھر کر لانے کا کام
خرمے کے ساتھ جمالے کا تھا۔ میں تو ویسے ہی خوشی خوشی اس کے ساتھ چلا جاتا تھا۔ ایک
دو مرتبہ میں جمال دین کے ساتھ بھی گیا تھا لیکن میری چال اس کی چال کے ساتھ میل
نہیں کھاتی تھی۔ دو تین مرتبہ راستے میں ہی ٹب رکھنا پڑتا۔ اس لیے وہ مجھے اپنے ساتھ
بہت کم لاتا تھا۔ میری تو بس خرمے کے ساتھ ہی جوڑی تھی۔

سینٹرل جیل، لاہور، میں ایک ماہ گزارنے کے بعد جب میں ترنتارن گیا تھا تو جمال دین اور خرما مجھے پہلے ہی کی طرح تپاک سے ملے۔ اتنا ضرور تھا کہ خرما اب کچھ سنجیدہ ہوگیا تھا۔ مجھے جلدی ہی اس کے چپ چاپ رہنے کی وجہ بھی معلوم ہوگئی۔ ایک دن باورچی خانہ میں بیٹھا میں شکن جبین بنا رہا تھا کہ سامنے مسجد سے کسی کے اذان دینے کی آواز آئی۔ اذان کی آواز تو ہم دن میں کئی مرتبہ سنتے ہی تھے لیکن اس آواز کی بات ہی کچھ اور تھی۔ میرے لیے وہاں سے اٹھ کر کوٹھے پر جا کر مسجد کی چھت پر اذان دینے والے کو دیکھنا تو واجب بات نہیں تھی۔ اذان دینے والے بدلتے رہتے تھے اور اردگرد کے گھروں والے اذان کی آواز تو سنتے ہی تھے، اذان دینے والے کو دیکھنے کی کوشش کبھی نہیں کرتے تھے۔ دن رات کئی طرح کی آوازیں آتی رہتی تھیں لیکن یہ آواز کچھ جانی پہچانی تھی، کچھ انوکھی تھی۔

''بڑی اچھی اذان دے لیتا ہے''، میرے پاس ہی بیٹھی ہوئی نانی جی نے کہا۔

''خرما — ؟'' میں متحیر ہوکر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''ہاں — اب تو پانچوں وقت کا نمازی بن گیا ہے۔ بہت چھوٹی عمر میں ہی اس کی والدہ میرے پاس چھوڑ گئی تھی''، نانی جی نے مجھے بتایا۔

''آپ کے پاس — ؟'' میری حیرانی اور بڑھ گئی۔

''خرما کئی سال ہمارے پاس ہی رہا، پھر یہ دکان پر جانے لگا۔ شروع شروع میں وہ گھر جلد ہی لوٹ آتا اور کہتا — بے بے (اماں) میرا وہاں دل نہیں لگتا۔' میں جواب دیتی تجھے کون کہتا ہے وہاں جانے کے لیے؟ سال بھر یونہی ہوتا رہا''، نانی جی تھوڑا مسکرائے۔

''بھابوجی (نانی) مجھے اس بات کی حیرانی ہے کہ اس کی ماں آپ کے پاس کیسے چھوڑ گئی''، میرا اشتیاق اور بڑھ رہا تھا۔

''غریبی کی بدولت، بیری''، نانی جی نے آہ سی بھری، ''تین بھائی تھے یہ اور دو بہنیں۔ کمانے والا ایک، خرمے کا ابا۔ اس کا کام بھی کیا تھا باغوں کی نگرانی کرنا۔''

''بعد میں پھر اپنے گھر چلا گیا؟'' میں نے انھیں پوچھا۔

''اور کیا؟ دکان سے جب مہینے بعد کچھ پیسے ملنے لگے تو جا چڑھا ماں کی گود میں''، یہ کہتے ہوئے نانی جی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

باتیں کرتا کرتا میں باورچی خانہ کی سلاخوں والی کھڑکی پر جا کھڑا ہوا۔ خرما مسجد سے باہر آ رہا تھا۔ سفید قمیض، سفید تہبند، گورا رنگ، بھورے بال، کانوں میں مُرکیاں، گلے میں تعویذ، جوتی چڑھاویں، چال میں توازن، چہرے پر جلال، ابھی دو دن پہلے ہی اسے پوچھا تھا۔

''کیا بات ہے، خرمیا، تو آج کل میرے ساتھ اچھی طرح بولتا نہیں؟''

''کوئی بات نہیں، بھاجی، ایسے ہی آپ کا وہم ہے، میں تو ویسا ہی ہوں۔''

''ویسے تو اسی طرح کا ہی ہے چپکے ہوئے کانوں والا، لیکن کیوں کوئی بات چیت نہیں کرتا؟''

کان تو، بھاجی، کشتی لڑنے کے دنوں میں چپک گئے تھے۔ مجھ سے بڑی عمر کا ایک مضبوط اور طاقتور پہلوان تھا، وہ جب بھی مار دھاڑ کرتا میرے کانوں پر ہی کرتا۔ پہلے پہل تو مجھے بہت تکلیف ہوتی تھی، کانوں پر سوزش آتی، پھر یوں ہو گیا کہ جب تک وہ میرے کانوں پر دو چار نہ جماتا کشتی لڑنے کا مجھے مزہ ہی نہ آتا۔

''ان دنوں تمھاری خوب دھوم مچی ہوئی تھی۔ پھر تم نے کشتی لڑنا بالکل ہی چھوڑ دی۔''

''دیکھو بھاجی، کشتی لڑنے والے کو اچھی خوراک کی ضرورت ہوتی ہے — دودھ، گھی، بادام، پہلے پہل تو میں اچھا کھا پی لیتا تھا، پھر سب کچھ بند ہو گیا۔''

''کیوں — پھر کیا ہوا خرمیا؟''

''ہوا کچھ بھی نہیں بس یونہی۔''

''دیکھ خرمیا، مجھ سے کوئی بات نہ چھپا۔''

''مجھ سے بڑی دو بہنوں کے رشتے کی بات جب چلی تو میری اماں نے کہا — کچھ ان کے لیے بھی جمع کرے گا کہ سب کچھ کھا پی کر ہی چھوڑے گا؟ اس دن کے بعد میں

اکھاڑے نہیں گیا۔"

آخری فقرہ بولتے ہوئے اس نے اپنا منہ پرے ہٹا لیا۔ پھر اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی کے ساتھ اپنی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسوؤں کو صاف کیا۔ جب اس نے میری طرف دیکھا،اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکان تھی۔ ایک مرتبہ پھر آنسو اس کی آنکھوں میں اکٹھا ہونے شروع ہو گئے تھے۔

اب ہم تقریباً ایک سال کے بعد ہی ایک دوسرے کو ملے تھے۔ اس ایک سال کے دوران اس میں بہت بڑی تبدیلی آ گئی تھی۔ اکھاڑا چھوڑنے کی وجہ سے اداس رہنے لگا تھا، جیسے اس کا دل ٹوٹ گیا ہو۔ کچھ دیر بے چینی کی حالت میں رہنے کے بعد وہ گلی والی مسجد کے مولوی کے رابطے میں آ گیا۔ وہ مولوی بہت پہلے سے خرے کو جانتا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب وہ ایک طرح سے بھابوجی کا بیٹا بن کر ہمارے ننھیال کے گھر رہا کرتا تھا۔ چار خالائیں تھیں میری، چھوٹی دو تو خرے کو ابھی بھی ویرا (بھائی) کہہ کر بلاتی تھیں۔ ان کا اپنا بھائی کوئی نہیں تھا، شاید اس بنا پر خرا بھی ان سب کو بہنوں والی عزت دیتا تھا۔ پرانی شناسائی کی وجہ سے ہماری گلی کی مسجد کے مولوی نے خرے کو پانچ وقت کا نمازی بنا دیا۔ آہستہ آہستہ وہ اذان دینے کے قابل ہو گیا۔ خرے کا گھر ہماری گلی میں تو نہیں تھا، تھوڑی دور بیرونی طرف تھا، لیکن ان کے گھر کے نزدیک یہی مسجد تھی۔

خرے کی چندھیائی ہوئی آنکھیں بھی اب ٹھیک ہونے لگی تھیں۔ وہ اس لیے کہ سول ہسپتال کے کمپاؤنڈر چاچا نوردین نے اس کے ککرے ٹھیک کر دیے تھے اور اسے ایک دوائی آنکھوں میں ڈالنے کے لیے بھی دی تھی۔ ہر روز شام کو، سورج غروب ہونے سے پہلے، چاچا نوردین ناناجی کی دکان پر آ کھڑا ہوتا۔ وہ دونوں ہمیشہ کوئی نہ کوئی ظریفانہ بات کرتے اور دیر تک ہنستے رہتے۔ میں چاچا نوردین کو اچھی طرح جانتا تھا۔ بچپن ہی سے میں اس دکان پر جانے اور کتنی کتنی دیر وہاں بیٹھے رہنے کا شوقین تھا۔ جب میں چھوٹا ہوتا تھا تو ناناجی نے چھابوں کی پہلی قطار کے دوسری طرف کے پہلے چھابے میں میرے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی ہوئی تھی۔ اس وقت کے جانے پہچانے والے کئی گاہک میری آنکھوں میں پڑے دھاری

دار سرے کی میرے نانا جی کے آگے تعریف کرتے ہوئے ہنس پڑتے — کاکا، آج تو سرے کی شیشی ہی خالی ہوگئی ہوگی۔ میں تھوڑا سا شرما کر ہنس پڑتا لیکن میرے نانا جی آگے جواب دیتے۔ 'دیکھنا' کہیں لڑکے کو نظر ہی نہ لگا دینا۔ وہ بندہ جواب دیتا، نظر کیسے لگ جائے گی، دیکھتا نہیں اس کے کان کے پاس نظروٹو بنا ہوا ہے۔ اس بات پر سبھی کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔

چچا نوردین اس طرح کا مذاق مجھے کبھی نہیں کرتے تھے۔ ان کے دیکھتے دیکھتے میں چھابے میں بیٹھنے کی بجائے چھابے کے پاس اسٹول پر بیٹھنے لگ گیا تھا۔ پھر میری آنکھوں میں سرے کی پہلی والی بھرمار بھی نہیں ہوتی تھی۔ ویسے بھی میں اب بڑا ہوگیا تھا۔ چچا نوردین عام طور پر نانا جی کے آگے پڑے مولیوں کے ڈھیر میں سے نرم اور تازہ ہرے پتے چن چن کر کھایا کرتے تھے۔ ایک دن وہ ہرے پتے کھانے کی بجائے، کیلوں کے ایک گچھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے۔

''لاؤ بھئی، سیٹھ رادھا کشن، ایک کیلا تو کھلاؤ۔''

''ایک یا دو — ؟''

''چلو دو ہی دے دو اور بتاؤ۔''

''لے پکڑ نور دینا، بری چھیل کے یہ — اچھا، یہ بتاؤ نیا ڈاکٹر ابھی آیا ہے کہ نہیں؟''

''نہیں، ابھی تو نہیں آیا۔''

''پھر، کام کیسے چلتا ہے؟''

''میں ہی چلا جاتا ہوں، جو کوئی مریض تشویشناک ہوتا ہے، امرتسر بھیج دیتا ہوں۔''

''یار، میری کھانسی کا بھی کوئی علاج کرو۔''

''تمھارا علاج، رادھا کشنا، اس وقت تک نہیں ہوسکتا، جب تک تم شراب نہیں چھوڑتے۔''

''نوردینا، اگر شراب چھوڑ دی تو تکلیف اور بڑھ جائے گی۔''

اس بات پر وہ دونوں ہنس پڑے۔ انھیں ہنستا ہوا دیکھ کر میں بھی ہنس پڑتا۔ اس

وقت چچا نوردین نے میری طرف دیکھا اور مجھے پوچھنے لگے۔

''اب تو کونسی کلاس میں پڑھتا ہے، کاکا؟''

''جی، ساتویں میں۔''

''اس وقت تو کونسی کلاس میں پڑھتا تھا؟''

''جی، تیسری میں۔''

میرا جواب سن کر وہ ہنسنے لگے اور کچھ جھینپتے ہوئے میں بھی تھوڑا ہنسا۔ مجھے وہ واردات اچھی طرح یاد تھی۔ کچھ سال پہلے میں نراتوں کے دنوں میں اپنی بھائی جی کے ساتھ رام لیلا دیکھنے ترنتارن گیا تھا۔ دراصل میں ان دنوں ہی ہر سال وہاں جایا کرتا تھا۔ اس وقت رام لیلا ختم ہونے کے اگلے دن ہم صبح صبح تانگوں کے اڈے پر پہنچ گئے۔ نانا جی ہمیں وہاں چھوڑنے کے لیے آئے۔ امرتسر جانے کے لیے ایک یکہ تیار کھڑا تھا۔ دو مرد اور دو عورتیں پہلے ہی اس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم بھی ان کے ساتھ جا بیٹھے۔ اب صرف ایک سواری کی اور ضرورت تھی۔ اتنے میں چچا نوردین، ہاتھ میں تھیلا پکڑے ہوئے آتے ہوئے دکھائی دیے۔

''کدھر کو، نوردینا؟'' نانا جی نے اسے پوچھا۔

''گورو کی نگری''، اس نے جواب دیا۔

''تو پھر راستے میں ان کا دھیان رکھنا''، نانا جی نے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کوئی فکر مت کر، رادھا کشنا''، چچا نوردین نے یکے میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اچھا بچی''، نانا جی نے بھائی جی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، ''تمھارے چچا تمھارے ساتھ ہیں، لڑکے کا خیال رکھنا۔''

ہچکولے کے ساتھ یکہ چل پڑا۔ صبح کا وقت ہونے کی وجہ سے ہوا میں خنکی تھی۔ جلدی ہی سورج کی کرنوں کی گرماہٹ محسوس ہونے لگی۔ سڑک پر ابھی زیادہ آمدورفت شروع نہیں ہوئی تھی۔ دھیمی چال چلنے والا گھوڑا جلد ہی سبک گامی پر اتر آیا اس کی سموں کی

ٹاپ صبح کے پرسکون ماحول میں بہت اچھی لگ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ڈبرجی کا اڈہ آ گیا۔ اپنی عادت کے مطابق ہی جیسے گھوڑا وہاں رک گیا۔ گھوڑے نے پانی پیا اور ایک دو سواریاں بھی نیچے اتریں۔ تازہ دم ہوکر گھوڑے نے پھر اپنی رفتار پکڑلی۔ سڑک آگے سے کافی دور تک خالی نظر آ رہی تھی۔ یکے والے نے اپنی ہی دھن میں گھوڑے کو دو تین چابک مارے اور گھوڑا جیسے سرپٹ دوڑنے لگا۔ سبھی سواریاں ڈر گئیں۔ میں نے اپنے ساتھ بیٹھے چچانوردین کا بازو پکڑ لیا۔ یکے والے نے ایک طرف جھک کر دیکھا۔ جلدی ہی اس نے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ اتنی دیر میں دائیں طرف کے پہیے کے اوپر چڑھا ہوا ربڑ کا گولہ گھومتا ہوا دور جا گرا۔ یکے کے رکتے ہی ساری سواریاں نیچے اتر آئیں۔ وہاں سے چاپی وِنڈ کی نہر زیادہ دور نہیں تھی۔ نہر کے پل سے چاپی وِنڈ کے گیٹ تک تانگے عام مل جاتے تھے۔ اس امید کے ساتھ ساری سواریاں جلدی جلدی قدم اٹھانے لگیں۔ میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ یکے والا گھوڑے کی لگام تھامے، رنجیدہ خاطر آہستہ آہستہ چلا آ رہا تھا۔ مجھے اس کی یہ حالت دیکھ کر ترس سا آیا۔

چاپی وِنڈ کی نہر کے پل پر ہمیں کوئی تانگہ نظر نہ آیا۔ یہ دیکھ کر سبھی سواریوں کے منھ گویا اتر گئے۔ انھوں نے ایک اور کوشش کر کے چاپی وِنڈ کے گیٹ تک پہنچنے کا مشورہ کیا۔ اس سے آگے جانا میرے لیے مشکل کام تھا۔ کچھ دن پہلے گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے میرے دائیں پاؤں کا انگوٹھا اتر گیا تھا۔ یہاں تک تو میں اپنے دکھتے انگوٹھے کو تھوڑا نیچے دبا کر چلتا آیا تھا۔ اب اور زیادہ اس طرح چلنا ممکن نہیں تھا۔ زبردستی میں لنگڑا کر چلنا شروع کر دیا۔ میری یہ حالت دیکھ کر بھائی جی گھبرا گئے۔ اتنے میں چچانوردین نے مجھے اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ پھر وہ میرے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دوسروں سے آگے نکل آئے۔

''بیری، تو نے ابھی پگڑی باندھنی شروع نہیں کی؟''

''ابھی نہیں — نہم کلاس میں جا کر شروع کروں گا۔''

''اتنی دیر، یہ پٹکا ہی چلے گا؟''

''ہاں جی۔''

"اچھا یہ بتا، کس طرح کی باندھا کرے گا تو پگڑی؟"

"اپنے باؤ جی جیسی۔"

"اپنے نانا جیسی نہیں؟"

"نہیں، وہ تو موٹے ہیں پگڑی کو سر پر یونہی لپیٹ لیتے ہیں — گول گول۔"

"بیری، تمھارا ایک چچا موٹا ہے نا؟ گزشتہ سال ترنتارن اماوس نہانے آیا تھا۔"

"ہاں جی، لیکن میرے ماما جی نے کیس رکھے ہوئے ہیں۔"

"بہت عقل مند ہو گیا ہے بیٹا، جیتے رہو۔"

"اس طرح باتوں ہی باتوں میں ہم جالی وڈ کے گیٹ تک پہنچ گئے۔ چچا نوردین نے مجھے ایک چبوترے پر بٹھا دیا اور آپ خود میرے پاس کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں میرے بھائی جی بھی باقی عورتوں کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ چچا نوردین نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور کہنے لگے۔

"یہ کندھوں پر چڑھ کر بہت خوش ہوتا ہے۔"

"نوری چچا، آپ کو اس نے بہت تنگ کیا ہے۔"

"نہیں بٹی، یہ تو بڑا شریف لڑکا ہے — اچھا پھر، میں چلتا ہوں۔"

"ہمارا گھر یہاں سے اب نزدیک ہی ہے، دودھ پی کر جاتا۔"

"نہیں بیٹا، آج میں نے یہاں ڈھیر سارے کام کرنے ہیں۔ کبھی پھر آؤں گا، اپنے دوست کے ساتھ۔"

"ابھی میں نے دسویں نہیں کی تھی کہ چچا نوردین ریٹائر ہو کر ہماری گلی کے نزدیک مسلمانوں کے محلے میں رہنے لگے۔ وہاں ان کا کوئی رشتے دار رہتا تھا۔ اس گلی میں انھوں نے گھر لیا، اس کے سامنے والی دکان لے کر انھوں نے ڈاکٹری شروع کر دی۔ ان کا زیادہ کام مرہم پٹی کرنا یا چھوٹی موٹی دوائی دینا ہی تھا۔ بعد میں پنسلین کے انجکشن لگانے کا ان کا کام اچھا چل پڑا۔ ان کی آمدنی بڑھ گئی۔ کبھی کبھی میں ان کے پاس دوائی کے لیے یا

گپ شپ ہانکنے کے لیے جا بیٹھتا۔ وہ میری طرف خاص دھیان دیتے تھے۔ ایک مرتبہ گرمیوں کے دنوں میں میرے چھوٹے بھائی اور بہن کی آنکھیں دکھنے آگئیں۔ ہر روز صبح میں ان دونوں کو چچانوردین کی دکان پر لے جاتا۔ وہ پہلے ان کی آنکھیں دھوتے، پھر دوائی ڈالتے۔ ان کی آنکھوں میں ککرے پڑجانے کی وجہ سے، اس کام کو دو تین ہفتے لگ گئے۔ آخری دن میں نے پانچ کا نوٹ ان کی طرف بڑھایا۔ انھوں نے پہلے تو میری طرف دیکھا، پھر غصے میں پوچھنے لگے "یہ کیا؟"

"یہ تو کچھ نہیں، چچاجی۔"

"ارے، میں تو اپنی بیٹی کے گھر کا پانی بھی نہیں پی سکتا، تو مجھے نوٹ دے رہا ہے۔"

"آپ نے زحمت بھی تو بہت اٹھائی ہے۔"

"زحمت تو میں نے بیٹا، اس وقت بھی اٹھائی تھی، جب تمھیں کندھوں پر اٹھایا تھا۔ یاد ہے نا؟"

اتنا کہہ کر وہ ہنسنے لگے اور نہ چاہتے ہوئے بھی میری ہنسی نکل پڑی۔ میں بعد بھی کئی مرتبہ ان کے پاس دوائی کے لیے جاتا رہا، اس سال سردیوں میں میرے ہاتھوں کی انگلیوں میں سوزش آگئی۔ ایک ہاتھ کی دو انگلیوں میں اتنی سوزش آئی کہ ان میں زخم ہوگئے۔ علاج کے لیے میں چچانوردین کے پاس ہی گیا۔ وہ پہلے ان زخموں کو صاف کرتے پھر دوائی لگا کر پٹیاں کردیتے۔ کھانے کے لیے کچھ گولیاں بھی وہ اپنے پاس سے ہی دیتے، ٹھیک ہوجانے پر میں نے ڈرتے ڈرتے ان کو کچھ روپے لے لینے کے لیے کہا، لیکن میری بات سنتے ہی ان کے ماتھے پر شکن پڑنے لگی۔ پھر انھوں نے ٹکٹکی لگا کر میری طرف دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں — 'یاد ہے وہ دن؟'

فروری سن سینتالیس کے شروع میں ہی فسادات شروع ہوگئے۔ ایک دن پہلے لاہور میں کچھ گڑبڑ ہوئی اور اگلے دن امرتسر میں آتش زنی کی وارداتیں شروع ہوگئیں۔ حالات روز بروز خراب سے خراب تر ہوتے گئے۔ کئی کئی ہفتے میں چچانوردین کی دکان کی طرف

گزرنے سے گریز کرتا۔ وہاں سے ہاتھی گیٹ تک مسلمانوں کی گنجان آبادی تھی۔ بے شک انھوں نے کبھی ادھر کے کسی ہندو، سکھ کو کچھ نہیں کہا تھا لیکن دل میں خوف و ہراس ہونے کی وجہ سے کوئی ادھر سے کم ہی گزرتا تھا۔ بیچ بیچ میں حالات معمول کے مطابق بھی ہوجاتے۔ ایک دوسرے کی طرف سے گزرنا آسان ہوجاتا۔ ادھر کی عورتیں بھی صبح صبح اس طرف سے گزر کر سیتلا مندر ماتھا ٹیکنے آتیں۔ اس وقت یوں ظاہر ہوتا جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ان دنوں میں چچا نوردین کے پاس جا بیٹھتا۔ ادھر ادھر کی باتیں شروع ہوجاتیں۔ پھر وہ منھ میں آہستہ آہستہ ہنستے۔ میں ان کی طرف دیکھتا۔ ان کی آنکھوں میں انوکھی چمک آجاتی۔ میں فوراً سمجھ لیتا کہ انھیں وہ دن یاد آرہے ہیں جب انھوں نے مجھے اپنے کندھوں پر اٹھا کر کافی فاصلہ طے کیا تھا—

''اس وقت تو کون سی کلاس میں ہوتا تھا، کاکا؟''

''جی، تیسری جماعت میں۔''

ان دنوں میں انھیں ملنے کے لیے چلا تو جاتا لیکن کچھ مسلمان لڑکے اس بات کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ وہ دانستہ ان کی دکان کے آگے سے گزرتے اور مجھے گھورتے۔ میں بھی ویسے ہی ان کی طرف دیکھتا۔ ان میں سے ایک لڑکا مجھ سے حسد رکھتا تھا۔ میں اچھے دنوں میں گول باغ، گندے نالے کے پاس بنے اکھاڑے میں کشتی لڑنے کے لیے جایا کرتا تھا۔ بڑے بڑے پہلوان وہاں کشتیاں لڑنے آتے تھے۔ ان کے آنے سے پہلے دونوں اطراف کے لڑکے تھوڑی دیر کے لیے زورآزمائی کر لیتے تھے۔ میں بھی شام کے وقت وہاں پہنچ جاتا اور نیکر اتار کر لنگوٹی کستا ہوا اکھاڑے میں داخل ہوتا۔ مسلمانوں کے لڑکے اس اکھاڑے کو صرف اپنا اکھاڑا سمجھتے تھے اور ہمارے ساتھ حسد رکھتے تھے۔ اس لیے ایک تو وہ ہمارے ساتھ بھدّا مذاق اور مسخری کرتے، دوسرے وہ ٹھبیاں دے کر نیچے گرانے کی کوشش میں رہتے۔ ایک لڑکا حمیدا، مجھ سے کافی حسد رکھتا تھا اور اکھاڑے میں داخل ہوتے ہی وہ مجھ سے گتھم گتھا ہوجاتا۔ ہم ایک دوسرے کی گردن پر ہاتھ رکھ کر دوسرے کو نیچے کو کھینچتے یا

دائیں ٹانگ کے ساتھ ٹھسی دیتے یا دھوبی پٹڑا مارتے۔ ایک بار میں اسے نیچے گرا کر خوب گھسایا اور پھر ٹخنے سے پکڑ کر اسے چت کر دیا تھا۔ اس وقت سے وہ مجھے تکنی بھری نظروں سے دیکھنے لگ گیا تھا اور لڑنے جھگڑنے کا بہانہ ڈھونڈتا تھا۔

چچانورودین ہی کی گلی میں رہنے کی وجہ سے وہ لڑکا مجھے آتے جاتے دیکھتا رہتا۔ جب وہ مجھے دکان پر بیٹھا ہوا دیکھتا تو گھورتے ہوئے گزر جاتا۔ ایک دن حمیدے نے مجھے اپنی گلی سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا اور اپنے دو تین ساتھیوں کے ساتھ چچانورودین کی دکان سے تھوڑا ادھر آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں جب ان کے نزدیک پہنچا تو ان میں سے کسی ایک نے مجھے مونڈھا مارا۔ اتنے میں کسی دوسرے نے مجھے جپھی ڈال کر ٹھسی دینے کی کوشش کی۔ میں نے اس کی پسلیوں پر گھونسہ مارا اور گردن سے پکڑ لیا۔ شور وغل کی آواز سن کر چچانورودین اپنی دکان سے باہر آ گئے۔ آتے ہی انھوں نے ایک لڑکے کے تھپڑ رسید کیا اور دوسرے کو گریبان سے پکڑ لیا۔ تیسرا لڑکا وہاں سے دوڑ گیا۔ وہ دونوں لڑکے ممیانے لگے۔ اچھی خاصی جھڑکیاں دے کر انھوں نے ان دونوں کو چھوڑ دیا۔ منھ بسورتے ہوئے وہ ادھر ادھر کھسک گئے۔ پھر میرا بازو پکڑ کر وہ مجھے اپنی دکان پر لے گئے۔ کسی کو بھیج کر انھوں نے اپنے گھر سے میرے لیے دودھ منگوایا۔ اس دن وہ مجھے پرتپاک طریقے سے ملے لیکن ان کا دل بہت اداس تھا۔ اس دن وہ مجھے پرانی بات یاد کروا کر ہنسنا بھی بھول گئے۔

کچھ ہفتوں بعد فسادات پھر بھڑک اٹھے۔ ایک دوسرے کی طرف آمدورفت کا سلسلہ بند ہو گیا۔ چھرازنی کا اکا دکا وارداتیں ہونے لگیں۔ تبھی مجھے ایک شام خبر ملی کہ کسی نے چچا نورودین کے چھرا گھونپ کر مار دیا ہے۔ اصل میں وہ دو فرقوں میں ہونے والی لڑائی کو روکنے کی کوشش میں تھے۔ اتنے میں کسی جلدباز نے انھیں چھرے کا نشانہ بنا ڈالا۔ یہ خبر سنتے ہی میں جلدی جلدی اپنے گھر کی سیڑھیاں اترا اور گلی سے دوڑتا ہوا باہر بازار میں چلا گیا — میں نے جب چچانورودین کی دکان کی طرف دیکھا تو وہاں ایک ٹھکھٹا لگا ہوا تھا۔ آگے بڑھتے ہوئے میرے قدم خودبخود رک گئے۔ ادھر بھی کئی لوگ ٹولیوں کی شکل میں

کھڑے تھے۔ کسی وقت بھی ہنگامہ ہو سکتا تھا۔ چچا نورو دین کی لاش سڑک پر ہی پڑی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے کسی نے ان کی لاش کو چادر کے ساتھ ڈھانپ دیا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ان کو آنکھوں میں ہی سمیٹتا ہوا واپس اپنی گلی میں آ گیا۔

یہ واردات میرے سینٹرل جیل جانے سے کچھ دن پہلے ہی واقع ہوئی تھی۔ اس کے متعلق میرے ناناجی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ اب جب میں ترنتارن آیا تو ان کے ساتھ چچا نورو دین کے مارے جانے کی بات کی۔ انھیں بہت افسوس ہوا اور اس دن انھوں نے سارا دن کچھ نہ کھایا۔ سن سینتالیس کی جولائی کا مہینہ میں نے ترنتارن میں گزارا۔ اصل میں ان دنوں ہمارے گھر کے سبھی افراد وہیں آ گئے تھے۔ امرتسر میں دونوں فرقوں کے درمیان آپسی کشیدگی بہت بڑھ گئی تھی اور ہر روز کوئی نہ کوئی واردات ہو جاتی تھی۔ کسی وقت کچھ بھی ہو جانے والی کیفیت تھی اس وقت۔ اس کے مقابلے میں ترنتارن میں مکمل امن و امان تھا۔ لگتا تھا کہ یہاں کبھی بھی کوئی ناگوار واقعہ نہیں ہوگا۔ لیکن یہ بات خیال خام ہی ثابت ہوئی۔ اگست کی دو تاریخ کو رات کے دو بجے تحصیل بازار میں زبردست بم دھماکہ ہوا۔ لوگوں کے دل دہل گئے۔ سوئے پڑے لوگ خوف زدہ ہو کر اٹھ بیٹھے۔ یوں تھا جیسے رات کے سناٹے کو کسی نے الف ننگا کر دیا ہو۔ دور دور تک کتے بھونکنے لگ پڑے۔ کئی لوگ تو کوٹھوں سے اتر کر نیچے آ گئے، اگرچہ وہاں اس وقت بلا کی گرمی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے رات ہی رات میں امرتسر شہر پھیلتا پھیلتا ترنتارن تک پہنچ گیا ہو — 'یا خدا! اب کیا بنے گا۔' ایک ہوک سی میرے دل میں اٹھی اور وہ ساری رات میں نے چارپائی پر کروٹیں بدلنے میں گزاری۔

حسب معمول خرمے نے علی الصبح مسجد کی چھت پر کھڑے ہو کر اذان دی۔ 'اللہ اکبر — اللہ اکبر' میں اٹھ کر منڈیر کے پاس گیا اور تھوڑا جھک کر مسجد کی چھت کی طرف دیکھا۔ خرما اپنے کانوں میں انگلیاں ڈالے اذان دے رہا تھا، جیسے وہ اپنے اردگرد سے بے نیاز ہو۔ اس کا ناتا قد اس وقت مجھے بھی اونچا محسوس ہوا۔ اذان دینے کے بعد، مسجد کی

سیڑھیوں سے اترتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا۔ یوں لگا جیسے اس نے مجھے دیکھا ہی نہ ہو یا اس کی نظروں نے مجھے دیکھنے سے انکار کردیا ہو۔ میرے دل کو ٹھیس سی لگی۔ سبک قدموں سے سیڑھیاں اترتا ہوا وہ مسجد کے دروازے تک پہنچ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اوپر کو دیکھے گا، لیکن ایسا نہ ہوا۔ مسجد سے باہر نکل کر اس کی چال میں روانی آ گئی۔ اپنے دونوں بازو کھول کر وہ چل رہا تھا۔ اس کی سفید تہبند ہوا کے ساتھ پھولی ہوئی تھی اور اس کے پاؤں میں پڑی کھال کی جوتی مروڑا نہیں جھیل رہی تھی۔

10

بم دھماکوں کی وجہ سے لوگ گھبرا گئے۔ دن چڑھتے ہی چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ ترنتارن کا کوئی باشندہ یہ کام نہیں کر سکتا۔ یہ کسی بیرونی آدمی کا کام تھا۔ یہ لوگ صدیوں سے شری گورو ارجن دیو جی کے بسائے ہوئے اس شہر میں امن و سکون سے رہ رہے تھے اور ایک دوسرے کا کبھی بھی برا نہیں سوچ سکتے تھے۔ ہماری اس دو دہانی چوڑی گلی کے سرے پر حکیم رحمت علی کا شفاخانہ تھا۔ اس کے آگے تحصیل بازار شروع ہو جاتا تھا۔ یہ حکیم اگرچہ نابینا تھے مگر ان کے ہاتھ میں شفا بہت تھی۔ نبض دیکھتے ہی یہ بیماری بتا دیتے تھے۔ ایک مرتبہ جب میں بیمار ہوا تو نانا جی مجھے ان کے پاس لے گئے۔

''اپنا نواسہ ہے، حکیم جی''، نانا جی نے میرا ہاتھ ان کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کیا نام ہے تمھارا کاکا؟'' حکیم جی نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''جی بلبیر سنگھ —''، میں نے بتایا۔

''شاباش! اتنا کہنے کے بعد انھوں نے میری نبض پر اپنی انگلیاں رکھ دیں۔''

''امرتسر میں اسکول میں پڑھتا ہے۔'' نانا جی نے بالتفصیل تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''کون سی جماعت میں، بیٹا؟'' حکیم صاحب نے میرے گلے کی گلٹیوں کو ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔

''جی، آٹھویں میں''، مجھے یہ کہنے میں ذرا دقت محسوس ہوئی کیونکہ حکیم جی ابھی بھی میرے گلے کی گلٹیوں کو دبا کر دیکھ رہے تھے۔

''رادھا کشن جی۔'' حکیم جی نے میرے نانا جی کے ساتھ بات چیت کی، کاکے کو گلے پڑ گئے ہیں۔ بخار بھی اسی وجہ سے چڑھ گیا ہے، ویسے اب فکر والی کوئی بات نہیں، تین

پڑیاں دے رہا ہوں انھیں صبح، دوپہر اور شام لسوڑھے کی چٹنی میں ملا کر چٹائیں، آرام ہو جائے گا۔ دن میں دو تین مرتبہ عرق گاؤزبان اور عرق سونف ملا کر پلاتے رہو۔''

''اور حکیم جی، اسے شکن جبین وغیرہ دے سکتے ہیں؟'' نانا جی نے تفصیل کے ساتھ پوچھا۔

''نہیں، گلا خراب کر دے گی، شربت نیلوفر یا شربت بجوری پلا دو — فائدہ کرے گا''

اتنا کہہ کر حکیم جی نے دوسرے مریض کی نبض پر انگلی رکھ دی۔

حکیم جی کا چہرہ بڑا متاثر کن تھا۔ گورا چٹا رنگ، جس میں سرخی کا دخل زیادہ، خش خشی داڑھی، مونچھیں درمیان سے صاف کی ہوئیں، سر پہ طلے دار ٹوپی، بدن پر انگرکھا، چھوٹی موہری والا پاجامہ اور دائیں ہاتھ میں ایک انگلی پر نگوں والی سونے کی انگوٹھی، آدھی مرض تو ان کے روبرو بیٹھ کر دور ہو جاتی تھی۔ بچپن میں مجھے جب بھی کوئی تکلیف ہوتی تو نانا جی یہیں لے کر آتے تھے۔ اس مرتبہ کیونکہ مجھے کئی دنوں تک ان کے پاس آنا پڑا تھا، اس لیے وہ میری آواز پہچاننے لگے تھے۔

جس رات ترنتارن میں دھماکہ ہوا، اس کے اگلے روز جب میں حکیم جی کے شفاخانے کے آگے سے گزرا تو وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میرے دل نے چاہا کہ میں ان کے سامنے بیٹھ جاؤں اور اپنا بازو ان کے آگے بڑھاتا ہوا پوچھوں — 'بتاؤ، حکیم جی، آپ کے پاس اس تکلیف کا کوئی علاج ہے؟ لیکن اگر انھوں نے آگے پوچھ لیا کہ کون سی تکلیف کا، تو کیا جواب دوں گا؟ یہ تکلیف کسی ایک کی تو نہیں تھی، سبھی کی تھی۔ اس وقت وہ اپنی گدی پر افسردہ دل بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا شاگرد، جو دوائیوں کی پڑیاں بناتا تھا اور عرق مربہ دیتا تھا کسی دوائی کو ہاون دستہ میں کوٹ رہا تھا۔ اس کا دھیان بھی ایک طرف لگا ہوا تھا کتنی دیر تک اسے پتا ہی نہ لگا کہ میں وہاں شیلف پر رکھی ہوئی بڑی بڑی بوتلوں پر چسپاں لیبل پڑھ رہا تھا — عرق سونف، عرق گلاب، عرق کیوڑہ، عرق گاؤزبان، شربت بجوری، شربت بادام، شربت خش خش، شربت صندل، شربت —

''کیا بات ہے؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

"کچھ نہیں —"، میرے منھ سے بے ساختہ نکلا، پھر ذرا سوچتے ہوئے میں نے کہا "حکیم جی کو ہاتھ دکھانا ہے۔"

"کون ہے —؟" حکیم جی جیسے خواب میں چونکے۔

"جی، میں ہوں بلبیر سنگھ — سیٹھ رادھا کشن کا نواسہ"، اتنا کہتے ہوئے میں ان کے آگے جا بیٹھا۔

"اچھا، اچھا— آ جاؤ"، وہ ہمدردی کے ساتھ بولے۔

"جی، میں پہلے بھی کئی مرتبہ آپ کے پاس آ چکا ہوں"، میں نے لاشعوری طور پر اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھا دیا۔

"کیا تکلیف ہے، کاکا؟" انھوں نے اپنی دو انگلیاں میری نبض پر رکھ دیں۔

"پتا نہیں، کل رات سے کچھ بے چینی سی ہے۔" میرے منھ سے نکلا۔

"گرمی بڑی شدت سے پڑ رہی ہے کاکا، ابھی تو اگست شروع ہوا ہے، اگلے مہینے موسم بدلے گا۔" انھوں نے میری نبض پر سے انگلیاں اٹھا لیں۔

"رات جب بم دھماکہ ہوا، اس کے بعد میری آنکھ نہیں لگی"، میں نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے کہا۔

"گھبرانے کی بات نہیں، کاکا، اللہ نے چاہا تو بالکل امن رہے گا۔"

"یہاں پتہ لگا ہے کہ کل امرتسر کے شریف پورہ محلے سے کوئی شرارتی عنصر آ گیا تھا۔ یہاں کا کوئی بھی انسان اس طرح کی شرارت نہیں کرسکتا"، حکیم جی نے پورے وثوق کے ساتھ کہا۔

"کہیں ایسا نہ ہو، حکیم جی، کہ یہاں بھی حالات بگڑ جائیں۔" میں نے اپنا خدشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں — کاکا، فکر والی کوئی بات نہیں، یہ وقتی ابال ہے، جلدی ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ اسے ہم وبا کہہ سکتے ہیں۔ جو ایک محلے سے دوسرے محلے میں پھیل جاتی ہے۔ اس وبا پر قابو پانے کے لیے تھوڑا بہت تو وقت لگے گا"، حکیم صاحب

کے چہرے پر تفکرات کی علامتیں نمایاں تھیں۔

''پتا نہیں، حکیم جی، اس وقت تک دونوں اطراف کا کتنا نقصان ہو جائے''، میں گویا اپنے آپ سے ہمکلام ہوا۔

''دیکھیے — خدا کو کیا منظور ہوتا ہے۔ گوروارجن دیو جی کی بسائی ہوئی نگری میں بیٹھے ہیں، گورو صاحب خود ہی بھلا کریں گے۔ یہاں آج تک دونوں فرقوں میں کوئی فساد نہیں ہوا۔ آپس میں گھی شکر ہیں۔ بھائی موہن سنگھ ویدسے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ آیورویدک اور یونانی میں جہاں کچھ فرق ہے وہیں ان میں کئی چیزیں مشترک بھی ہیں۔'' حکیم جی کے چہرے پر جلال تھا۔

''آپ بھائی صاحب کو ملا کرتے تھے؟'' میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

''ہاں، وہ مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنے کئی آزمودہ نسخے مجھے بتائے۔ میں تو ان کا احسان کبھی نہیں بھول سکتا۔'' حکیم جی ہلکا سا مسکرائے۔

''آپ ان کو کہاں ملا کرتے تھے؟'' میرے دل میں مزید کچھ جاننے کی تمنا پیدا ہوئی۔

''میں عام طور پر ان کے دولت خانہ پر چلا جاتا تھا۔ کبھی کبھی ہم دربار صاحب میں چلے جاتے اور مولسری کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر تبادلۂ خیال کرتے''، حکیم جی گزرے ہوئے وقتوں کی یادیں تازہ کر رہے تھے۔

''معاف کرنا، حکیم جی، مسلمان ہوتے ہوئے بھی آپ دربار صاحب چلے جاتے تھے؟'' میں نے ان سے نہ چاہتے ہوئے بھی یہ بات پوچھ لی۔

''بھول گیا ہے کاکا کہ اکال تخت کی حضوری میں مسلمان رباِبی اب بھی کیرتن کرتے ہیں۔ وہاں تُو بھی تو جاتا ہوگا؟'' انھوں نے حیرانی ظاہر کرتے ہوئے مجھے پوچھا۔

''جی جاتا ہوں، بلکہ کئی مرتبہ تو روز ہی چلا جاتا ہوں۔ کیرتن تو وہاں رباِبی ہی کرتے ہیں لیکن یہاں کے دربار صاحب کی بات ہی مختلف ہوگی؟'' میں یونہی بات کو کھینچے جا رہا تھا۔

''کاکا، ہر جگہ گوروگھر کی ایک ہی روایت ہے۔ گوردواروں کے دروازے سب کے لیے کھلے ہیں''، حکیم جی کے لہجے میں مٹھاس تھی۔

''اتنا کہتے ہوئے حکیم جی نے اپنے شاگرد کو گاجر کے مربے پر چاندی کا ورق لگا کر مجھے دینے کے لیے کہا۔ میں نے انھیں کچھ پیسے دینے کی کوشش کی لیکن انھوں نے میری پیٹھ تھپتھپائی اور خاموش کر دیا۔ ان کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوا میں ناناجی کی دکان پر چلا گیا۔ میں جب سے وہاں گیا تھا وہ میرے لیے 'ٹریبون' لے لیتے تھے۔ اس خیال کے ساتھ کے اس میں رات والے بم دھماکے کی خبر ہوگی۔ اس دن میں نے جلدی اخبار کی ورق گردانی کی۔ ورق گردانی کے بعد مجھے خیال آیا کہ یہ خبر اتنی جلدی کیسے چھپ سکتی ہے:

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک

مرزا غالب کا یہ مصرع میرے ذہن میں آیا۔ اس دن کے اخبار کی بڑی سرخی تھی — لاہور کی تحصیل پٹی بھارت میں رہے گی اور گورداس پور کی تحصیل شکرگڑھ پاکستان کا حصہ بنے گی، ناناجی کو میں نے جب یہ خبر سنائی تو وہ کہنے لگے۔

''ہم تو بیٹھے بٹھائے ہی پاکستان میں جانے لگے تھے۔''

''وہ کیسے، ناناجی؟''

''ہمارا آبائی مکان پٹی میں ہے۔ اب بھی وہاں ہماری حویلی ہے، کنواں ہے، تھوڑی بہت زمین ساتھ بھی لگتی ہے۔ گندم ابھی تک ہمیں وہیں سے آتی ہے۔''

''پھر یہاں کیسے آ گئے، ناناجی؟''

''یہاں تو ہمیں تمھاری بھابو کھینچ لائی۔ اس کے میکے اُدھر ڈھلواں کے ہیں اور یہ سارا گھرانہ رادھا سوامی ہے، بیاس والے ست گورو کو یہ بہت مانتے ہیں — بطور خاص اس کا بڑا بھائی، ڈاکٹر بھولا سنگھ، ست گورو کا بڑا عقیدت مند تھا۔''

''بس اتنی سی بات تھی، ناناجی؟''

''تمھاری بھابو چاہتی تھی کہ ترنتارن کے دربار صاحب کے دیدار روزانہ ہوں۔ اسی لیے وہ ابھی بھی ہر روز بلاناغہ گوردوارے جاتی ہے۔''

''لیکن آپ تو نانا جی، شام کے وقت ٹھاکر دوارے چلے جاتے ہو، کتھا سننے۔''

''ہاں، بیری، مجھے سگریٹ اور شراب پینے کی بہت بری عادت ہے — اسی لیے گوردوارے کم ہی جانا ہوتا ہے۔''

گزشتہ رات ایک ہی قسم کے بم دھماکے بیک وقت امرتسر اور لاہور دونوں جگہوں پہ ہوئے۔ پیار کی شکل ہر جگہ الگ الگ ہوتی ہے لیکن نفرت کا حلیہ ہر جگہ یکساں ہوتا ہے۔ مار دھاڑ، چھرے بازی اور آگ زنی کی وارداتیں ہر جگہ پہ بڑھ گئی تھیں، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا بنے گا — 'یا الٰہی، یہ ماجرا کیا ہے؟' میں نے اخبار کی موٹی موٹی سرخیوں پہ نظر دوڑائی اور گھر لوٹ آیا۔ گھر لوٹتے ہوئے میں رحمو قصاب کی دکان کے آگے سے گزرا۔ اس نے مجھے دیکھ کر نظریں چرالیں۔ پہلے وہ مجھے سلام کیا کرتا تھا۔ اس کی دکان سے گوشت لینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن جمال دین کی پھوپھی کا بیٹا ہونے کی وجہ سے وہ مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ آج اس کا رویہ دیکھ کر مجھے خوف سا طاری ہوگیا۔ میں مایوسی کے عالم میں ہی جا رہا تھا کہ آگے فتو چمار، اپنے ماتھے پہ تیوری ڈالے ہوئے مجھے ملا۔ مجھے دیکھ کر پہلے تو اس نے ایک طرف تھوکا اور پھر اچک کر اپنی دکان میں جا داخل ہوا۔ یہ دکان ہمارے گھر کے گیٹ کے ساتھ ہی تھی۔ اندر سے ہمارے باورچی خانہ کی کھڑکی اس دکان کے دروازے کے ساتھ کھلتی تھی۔

گھر پہنچا تو نانی جی باورچی خانہ میں کام کر رہے تھے۔ مجھے دیکھا تو کہنے لگے۔ ''لے آجا موڑھے پہ بیٹھ کر پودینے کی چٹنی رگڑ دے۔ تمھارے نانا کو یہ چٹنی بہت پسند ہے۔''

چپلیں اتار کر میں اونچے موڑھے پہ بیٹھ گیا اور کونڈی میں پڑے انار دانہ کو کوٹنے لگا۔ پہلے تو میں نے انار دانہ کو آہستہ آہستہ کوٹا لیکن جیسے ہی نانی جی نے دوری میں پیاز اور پودینے کے پتوں کو ڈالا تو ہاتھ میں پکڑے ڈنڈے پہ میری پکڑ مضبوط ہوگئی اور میں اسے زور زور سے دوری میں مارنے لگا۔ ابھی میں نے ایسا پانچ سات دفعہ ہی کیا تھا کہ باورچی خانہ کی کھڑکی کی سلاخوں میں سے مجھے فتے چمار کا گنجا سر اور مہندی رنگی داڑھی دکھائی

دی۔ پھر اس نے کسی اینٹ پر کھڑے ہو کر اندر کی طرف جھانکا۔
"کیا بات ہے فتے؟" نانی جی کی بھی اس پر نظر پڑی۔
"کچھ نہیں بھرجائی (بھابی) میں نے کہا پتا نہیں یہ زور زور کی آواز کاہے کی ہوتی ہے۔" وہ جیسے پاؤں کے بل کھڑا ہو گیا تھا۔
"منڈا (لڑکا) چٹنی رگڑتا ہے اور کاہے کی آواز آرہی ہے، یہاں"، نانی جی نے ذرا چڑ کر کہا۔
"ویسے تو بھرجائی کوئی بات نہیں لیکن زمانہ بڑا نازک ہے۔ آپ نے رات کو بم کی آواز نہیں سنی تھی؟" فتا یونہی بات کو لمبی کرتا جا رہا تھا۔
"سنی تھی ارے، دیورا (دیور) اور کچھ کہنا ہے تو اندر آجاؤ۔ یہاں پر کھڑے باتیں نہ بناؤ۔" نانی جی نے اس کی طرف ذرا پانسہ موڑ لیا۔
"نہیں، کام دینے والا بہت بڑا ہے۔ سوہنے شاہ کے لڑکے کی شادی ہے، ان کے لیے طلے والی جوتیاں تیار کرنی ہیں۔ پیچھے ہٹتا ہٹتا وہ پھر رک گیا" ہاں بھلا بھرجائی، اگر کوئی سلگتا اپلا ہے تو چلم کے لیے دے دو۔"
"ابھی تو فتے ہم نے آگ نہیں جلائی۔" اتنا کہہ کر نانی جی نے بمشکل اس سے اپنا پیچھا چھڑایا۔
کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد نانی جی نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگے، "بڑا برا ہے یہ سر چڑھا۔ تین شادیاں کروا چکا ہے ابھی چوتھی کی فکر ہے — کہتا ہے ہماری شرع کے مطابق ہی ہے سب کچھ۔ گھر میں روٹی کھانے کو نہیں لیکن ایک کے بعد دوسری کروائے جا رہا ہے۔ ایک لڑکے اور دو لڑکیوں کی شادی کر چکا ہے۔ لڑنے جھگڑنے کے لیے بھی ہر وقت آمادہ رہتا ہے۔ تمھارے نانا کو چھوڑ کر اس محلے میں کسی اور سے نہیں ڈرتا۔ تمھارے نانا کے ساتھ بھی ایک مرتبہ جھگڑ پڑا تھا۔ انھوں نے ایسا گھونسہ منھ پر مارا کہ دو گز دور جا گرا۔ تمھارے نانا نے اسے گریباں سے پکڑ لیا اور اسے اوپر اٹھا لیا اور اس کے منھ پر دو جڑیں۔ پھر کیا تھا اس دن سے لے کر آج تک فتا تمھارے نانا جی کے ساتھ نہیں جھگڑا۔

اس وقت سے مجھے بھرجائی کہہ کر بلاتا ہے۔ اس کی پہلی بیوی بہت اچھی ہے، اپنا سارا دکھ سکھ مجھ سے بانٹ لیتی ہے۔ سبزی لینے یا آم کا اچار مانگنے کے لیے وہ ہر دوسرے چوتھے روز اپنی کسی لڑکی کو میرے پاس بھیج دیتی ہے۔''

ہوا بھی ایسے ہی۔ شام کے کوئی چار بجے ایک گوری سی، نازک اندام اونچی لمبی، میلی شلوار قمیض اور کھٹے رنگ کے دوپٹے والی ایک لڑکی ہمارے صحن میں آگئی۔ نانی جی اس وقت گھر میں نہیں تھے۔ میں اسے دیکھ کر کمرے سے باہر نکل کر صحن میں آگیا۔ گھبرائی ہوئی نظروں سے اس نے میری طرف دیکھا اور دو قدم پیچھے ہٹ گئی —

''کہاں ہے، بھابو؟''

''کیا لینا ہے؟''

''کچھ نہیں — ان سے کام ہے۔''

''مجھے بتا دے وہ کام، انھوں نے ذرا ٹھہر کر آنا ہے۔''

''اچھا، میں پھر آجاؤں گی۔''

''اچار لینا ہے؟''

''تمھیں کیسے پتا ہے؟''

''تم نے اپنے ہاتھ میں رکابی جو پکڑی ہوئی ہے۔''

''آم کا اچار لینا ہے۔''

''لاؤ، پکڑاؤ اپنی رکابی، بھردوں اس کو۔''

''نہیں نہیں — اسے ہاتھ نہ لگانا، اندر سے لا دے کسی چیز میں۔''

''تم اندر جا کر خود ہی چاٹی میں سے لے لو۔''

'میں نے اندر نہیں جانا، تمھاری چاٹی ناپاک ہوجائے گی۔''

''کہیں نہیں ناپاک ہوتی، چلو آؤ اندر۔''

''نہیں، میں پھر آجاؤں گی۔''

''پھر کب، کیا پتا بھابو جی کب لوٹیں؟''

''کیا بات ہے، بیری''، نانی جی کی آواز سن کر میں گھبرا گیا۔ اس لڑکی کا رنگ بھی پھیکا پڑ گیا۔ نانی جی نے ہم دونوں کو ساتھ ساتھ کھڑے دیکھ لیا۔ میرا ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی رکابی پر تھا۔ میں شرمندہ سا ہو کر تھوڑا پیچھے ہٹ گیا۔ اچار لینا ہے، سکینہ، نانی جی نے اس کو پوچھا۔ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ نانی جی اندر باورچی خانہ میں چلے گئے اور مجھے آواز دی اسے اچار دے دینا تھا۔ لے پکڑ طشتری، اسے بھر کر اس کی رکابی میں ڈال دے۔ اتنا کہہ کر وہ کپڑے بدلنے کے لیے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ میں نے آم کے اچار سے طشتری بھری اور باورچی خانہ سے باہر آ گیا۔ سکینہ نے تھوڑا سا آگے بڑھ کر رکابی میری طرف بڑھا دی۔ اچار ڈالتے ہوئے میں نے اسے پوچھا، تمھارا نام سکینہ ہے؟ جواب میں اس نے میری طرف دیکھا اور دو تین مرتبہ آنکھیں جھپکیں، جیسے کہہ رہی ہو — اور کیا؟''

اچانک مجھے سلمیٰ یاد آ گئی۔ وہ بھی اسی طرح کی نازک سی تھی۔ وہ ہمیشہ میرے ساتھ لڑتی جھگڑتی رہتی تھی۔ اس کی ماں بڈھاں ہمیں لڑتے ہوئے دیکھ کر بہت حیران تھی۔ ہاتھی گیٹ سے باہر والا مکان بھائیا جی نے انھیں کرائے پر دیا ہوا تھا۔ کرایہ وصول کرنے کے لیے میں ہی ان کے گھر جاتا تھا اور میں میری جماعت میں پڑھنے والی سلمیٰ کے ساتھ محو گفتگو ہو جاتا تھا۔ سینٹرل جیل، لاہور سے واپس آ کر ایک دن میں ان کے گھر چلا گیا۔

''کب آیا تھا، بیری؟'' بڈھاں نے پوچھا۔

''کل دوپہر''، میں نے جواب دیا۔

''میرے پاس یہاں بیٹھ جاؤ۔'' بڈھاں نے اپنی چارپائی پر تھوڑی سی جگہ خالی کر دی۔

''سلمیٰ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا اور پھر ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی میں ان کے گھر کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ اس وقت سلمیٰ کھڑکی کے پاس بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی زیرِ لب مسکرائی اور پوچھنے لگی۔ ''جیت آئے ہو میدان؟''

''کون سا میدان؟ زور زبردستی پکڑ کے لے گئے، میں نے کسی کو کچھ نہیں کہا تھا۔''

''پھر دوسروں کو کچھ کرنے کے لیے اکسایا ہوگا۔''

''سلمیٰ، تم میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتی؟ میں تجھے اس طرح کا لگتا ہوں۔''

''لگتے تم چاہے کچھ ہوں، لیکن اندر سے بہت چالاک ہو۔''

''تمھیں مجھ پر کبھی یقین نہیں آتا۔ یہ تو پوچھا نہیں کہ وہاں میرے ساتھ کیا بیتی، بس لگ پڑی ہو دل کا غبار نکالنے۔''

''وہ تو تمھاری شکل ہی سے لگتا ہے کہ تم وہاں خوب مزے اڑاتے آئے ہو۔ تبھی تو اچھے خاصے موٹے تازے ہو گئے ہو۔''

''ہم وہاں سیاسی قیدی تھے، خدمت تو ہونی ہی تھی۔''

''اب آگے کیا ارادہ ہے بیری؟''

''اب ہم دونوں اکٹھے پڑھا کریں گے۔ تمھیں انگریزی نہیں آتی، مجھے فارسی میں ترجمہ کرنا مشکل لگتا ہے۔''

''انگریزی کی کمی تو شیریں آپا نے پوری کردی ہے۔''

''میری کمی تم پوری کردو۔''

''کون سی کمی؟ نمبر تو فارسی میں تم مجھ سے زیادہ لے جاتے ہو۔''

''اچھا یہ بتاؤ سلمیٰ، گزشتہ مہینے تم نے مجھے یاد بھی کیا تھا یا نہیں؟''

''ضرور کیا ہوگا لیکن مجھے یاد نہیں۔''

اس بات پر ہم دونوں ہنس پڑے۔ اور کتنی ہی دیر ہنستے رہے۔ اب سکینہ کی ادا نے میرے دل میں وہی سُر چھیڑ دیے تھے۔ جلدی جلدی کپڑے بدل کر میں سیر کے لیے باہر نکل گیا۔ اپنے گھر سے تحصیل بازار کی طرف جانے کی بجائے میں بائیں ہاتھ کی طرف مشن اسکول کی جانب چل پڑا۔ چھوٹا سا گرجا اور اس کے ساتھ ہی اسکول کی عمارت۔ اردگرد ہری گھاس کے میدان اور کیاریوں میں کھلے پھول، میں ایک درخت کے نیچے رکھے بینچ پر کچھ دیر بیٹھا رہا۔ میرے تھوڑے فاصلے پر پادری کے بچے ایک دوسرے کی طرف ربڑ کا رنگ پھینک رہے تھے۔ تھوڑی دور ایک مالی کیاری میں کھرپا چلا رہا تھا۔ ماحول میں

اگرچہ خاموشی تھی لیکن میرے اندر بے چینی بدستور قائم تھی۔ میں جلدی جلدی سلمیٰ سے ملنا چاہتا تھا۔ آنے والے وقت کا تصور کر کے میرا دل کانپ رہا تھا۔ پندرہ اگست زیادہ دور نہیں تھی۔ اس وقت تک کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ایک ڈر سا لگا ہوا تھا۔ طوفان آنے سے پہلے والی خاموشی کا عالم تھا۔ اس طرح تھا جیسے کوئی پتھر کسی پہاڑی سے لڑھک کر نیچے آ رہا ہو اور اسے روکنا کسی کے بس میں نہ ہو۔

میں سوچ میں ڈوبا ہوا وہاں سے اٹھ کر کچہریوں کی طرف چلا گیا۔ احاطے میں وکیلوں اور عرضی نویسوں کے تخت پوش خالی پڑے تھے۔ ہینڈ پمپ کو ایک شخص چلا رہا تھا اور اس کے دو ساتھی یکے بعد دیگرے پانی پی رہے تھے۔ میں تھوڑا آگے گیا تو سامنے رام لبھایا آتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں بھرا ہوا تھیلا تھا اور جلدی جلدی چلا آ رہا تھا۔ رام لبھایا میرے ناناجی کے چھوٹے بھائی گنگا بشن کا برادر نسبتی تھا۔ یہ تھوڑا عرصہ فوج میں باورچی کا کام کر چکا تھا اور وہاں سے آ کر اب تک کئی پاپڑ بیل چکا تھا۔ ان دنوں اس نے کسی کے ساتھ مل کر آموں کا باغ ٹھیکے پر لیا ہوا تھا۔ اچھی عادت کا مالک تھا لیکن باتونی بہت تھا۔

''بیری، آج تو کمال ہو گیا، تمھارے دیدار ہو گئے۔''

''بس ایسے ہی سیر کے لیے نکلا ہوا تھا۔''

''چلو گھر چلیں، باغ سے بڑے میٹھے آم لایا ہوں۔''

''پھر کبھی آؤں گا، اس مرتبہ ٹھیکہ کیسے رہا؟''

''اچھا رہا، کھا پی کر کچھ نہ کچھ بچ جائے گا۔''

''ٹھیک ہے پھر، اور کیا لینا ہے۔''

''بیری، رات بم دھماکہ سنا تھا؟''

''سنا تھا بھائی اب یہاں کیا بنے گا؟''

''بننا کیا ہے سِکھوں کے ہاتھ پیر کاٹ دیں گے۔''

''یہ تو ٹھیک بات نہیں، رام لبھایا۔''

"ٹھیک غلط کا تو مجھے پتا نہیں، لیکن ہوتا یہی ہے۔ شرارت انھوں نے کی ہے، ہم نے نہیں۔"

"کہتے ہیں باہر سے کچھ آدمی آئے تھے، کیا معلوم امرتسر سے؟"

"کہیں سے آئے ہوں لیکن لائے تو یہی ہیں۔ شیدا اور منیرہ بہت بڑی سازش بنائے بیٹھے ہیں۔ ہمیں بھی کسی نہ کسی طرح سراغ مل ہی جاتا ہے۔"

"دو چار لوگ اگر برے ہیں، رام لبھایا تو باقی حضرات کو دکھی اور پریشان نہیں کرنا چاہیے۔"

"بات تو بیری، پہلے حملہ کرنے کی تھی، وہ انھوں نے کر دیا ہے۔ اب تو ہم نے انھیں منھ توڑ جواب دینا ہے، ہماری بھی پوری تیاری ہے۔ آج ہماری طرف سے محلہ خوجگان میں بم چلے گا، تم دیکھنا کیا بنتا ہے۔"

"بات سنو، کہیں اس تھیلے میں بم تو نہیں؟"

"نہیں نہیں — بیری دیکھ لے، آموں کے ساتھ بھرا ہوا ہے۔ چلو گھر چلیں، ملٹری کینٹن کی رم کی بوتل بھی پڑی ہوئی ہے۔ سوچ میں نہ پڑو — آجاؤ چلیں — پھر دیکھنا نظارہ آدھی رات کو — اچھا پھر، اگر تمھاری مرضی نہیں تو۔"

"میں وہاں کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ بہت جلدی میں لگتا تھا، اُس پتھر کی طرح جو پہاڑی سے نیچے لڑھکنا شروع ہو چکا تھا۔

11

تایا جی کے گھر سے رات کھانا کھانے کے بعد میں اپنے گھر آ گیا۔ گلی میں ڈڈی کے چبوترے پر کچھ لڑکے تاش کھیل رہے تھے۔ پہلے تو میرے دل نے بھی چاہا کہ ان کے پاس بیٹھ کر تاش کی بازی دیکھوں۔ پھر خیال آیا کہ پتا نہیں میری جان پہچان کا کوئی ہے بھی یا نہیں۔ اپنے گھر کا دروازہ کھول کر میں ڈیوڑھی کی بتی روشن کی، آگے جا کر صحن کی ٹیوب کا سوئچ دبایا، پھر اندرونی کمرے کا دروازہ کھولا۔ ہر چیز ویسی کی ویسی اپنی جگہ پر پڑی تھی۔ کپڑے بدل کر میں نے اپنا بستر جھاڑا۔ دونوں سرہانوں کو اٹھا کر دیکھا کہ نیچے کوئی چھپکلی چھپی ہوئی نہ ہو۔ اس وقت چائے پینے کو دل چاہتا تھا مگر گھر میں پورا سامان نہیں تھا۔ باورچی خانہ میں چینی اور چائے پتی تو تھی لیکن دودھ نہیں تھا۔ قہوہ کے ساتھ بھی کام چل سکتا تھا، جیسا بنے گا ویسا پی لیں گے۔ اسٹوو پر پانی رکھ کر میں ڈیوڑھی کی بتی بند کرنے چلا گیا۔ اس وقت گلی میں چوکیدار کے چکر کاٹنے کی آواز آئی۔ پہلے وہ 'جے سیارام' کہتا اور پھر زمین پر اپنا ڈنڈا مارتا۔ جب وہ ہمارے چبوترے کے پاس آیا میں نے اپنا بیرونی دروازہ کھول دیا۔

''کیا حال ہے، چوکیدار؟''

''دیا ہے، بھگوان کی۔''

''کرفیو کل کھل جائے گا کہ نہیں۔''

''کہتے تو ہیں کہ صبح چھ بجے کھلے گا۔''

''آج کا دن کیسے رہا، چوکیدار؟''

''بہت برا، سردار جی۔''

''وہ کیوں؟''

کرفیو میں لوگ پان سگریٹ لینے، باہر نکل جاتے ہیں۔ پولس والے مجھے ڈانٹتے ہیں کہ میں گیٹ بند کر کے کیوں نہیں رکھتا۔ سی آر پی والے تو زبانی ہی جھڑکتے ہیں لیکن یہ لال وردی والے تو تھپڑ بھی لگا دیتے ہیں۔''

''چوکیدار، تم گاؤں کیوں نہیں چلے جاتے؟ تم تو پاکستان بنتے وقت بھی چلے گئے تھے۔''

''اس وقت کی بات اور تھی، سردار جی، وہ مسلمان لوگ تھے، کچھ بھی کر سکتے تھے۔ ہمیں ان سے بہت ڈر لگتا تھا۔''

''اب ان سے نہیں لگتا؟''

''لگتا تو ہے لیکن سوچتے نہیں کہ ہم نے کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ ہمارے ساتھ تو کسی کا کوئی جھگڑا نہیں، ہم تو پردیس میں نوکری کرنے آئے ہیں۔''

اتنا کہہ کر وہ واپس لوٹ گیا۔ کنوئیں کے پاس سے گزرتے وقت اس نے بلند آواز میں کہا، 'جے سیارام' پھر اس نے زمین پر زور سے ڈنڈا مارا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اگر اس نے اسی ڈنڈے کی آواز کے ساتھ لوگوں کو جگانا ہی ہے تو پھر پہرے کا کیا فائدہ۔ ابھی میں بیرونی دروازہ بند ہی کر رہا تھا کہ باورچی خانہ میں سے مجھے سرڑ سرڑ کی آواز آئی۔ میں دوڑ کر وہاں گیا۔ اسٹوو پر رکھے برتن کا پانی ختم ہو چکا تھا اور اس کا نچلا حصہ بری طرح جل رہا تھا جلدی سے میں نے اسٹوو بند کر دیا اور برتن کو نیچے اتار لیا۔

قہوہ پینے کے خیال کو دماغ میں سے نکال کر کمرے میں چلا گیا۔ نیند نہیں آ رہی تھی، اسی لیے دونوں سرہانے دیوار کے ساتھ لگا کر میں نے ڈھارس لگا لی۔ تایا جی سے میں یہ کتاب پڑھنے کے لیے لایا تھا۔ اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔ اس میں یونانی شاعرہ سیفو کی نظمیں تھیں۔ کسی پاکستانی شاعر نے ان نظموں کو اردو جامہ پہنا دیا تھا:

چاند کے گرد بزم تاروں کی
ماند پڑ جاتی ہے اچانک ہی

نرم کریں منقش کی چادر
جب زمیں پر بچھانے لگتی ہیں

نیند کی بدولت میری پلکیں بھاری ہونی شروع ہوگئیں۔ میرے سامنے کی دیوار پر دو چھپکلیاں ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہی تھیں۔ دوڑتے ہوئے ان کے منھ سے عجیب سی آواز نکلتی تھی۔ اس طرح کمرے کی فضا اور بوجھل ہوگئی۔ کمرے کے ایک کونے میں رکھے ہوئے ٹرنکوں کے پیچھے ہنڈے کی آواز آنی شروع ہوگئی۔ ہر گھڑی یہ آواز اونچی ہو رہی تھی، ہر پل یہ آواز پھیلتی جا رہی تھی۔

وہ بھی عجیب دن تھے۔ ابھی بلیو اسٹار آپریشن کو ہوئے چار پانچ مہینے ہوئے تھے۔ اکال تخت پر ہندستانی فوج کے تابڑتوڑ حملے کی وجہ سے پنجاب کے لوگ دو حصوں میں منقسم ہوگئے تھے۔ ایک فرقہ خوش تھا کہ فوج نے انھیں دشمن سے نجات دلوا دی تھی۔ دوسری طرف وہ طبقہ تھا جو اندر تک لہولہان ہو چکا تھا۔ عزتِ نفس کو کھروچ لگ چکی تھی۔ سزا کسی اور کو نہیں، صرف عقیدتمندوں کو ملی تھی، اور وہ بھی گورو ارجن دیو کے شہیدی پرب پر۔ نتیجے کے طور پر عوام الناس کی روح بڑی بے رحمی کے ساتھ جھنجھوڑ دی گئی تھی۔ شاید سیاست میں دھرم کا عنصر اتنا برا نہیں تھا، جتنا کہ مذہب میں سیاست کا۔ کتنی کاری تھی یہ ضرب لوگوں کے دلوں پر اور کتنا گہرا تھا یہ زخم، ان کے دلوں میں۔

آپریشن بلیو اسٹار کے بعد جب کالج کھلے تو اسٹاف روم میں بیٹھے ایک پروفیسر نے کہا، 'یہ کام بہت دیر کے ساتھ ہوا ہے، پہلے ہو جاتا تو اچھا تھا۔' دوسرے نے جواب دیا 'دیر آید درست آید' یہ باتیں سن کر کچھ اور پروفیسروں کے احساس میں خنجر اتر گئی۔ ایک بولا، ''کیا مطلب ہے آپ کا؟ کون سی بات درست ہوئی ہے؟ آپ ان کے گن گا رہے ہو جنھیں ہمارے آپسی پیار کے متعلق کوئی واقفیت نہیں؟ آپ کو پتا بھی ہے کہ اس طرح کی وارداتوں کے بعد کیا ہوتا ہے:

لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

اب یوں اترانے کی ضرورت نہیں، جون چوراسی کے بعد زندگی کی شکل ہی بدل گئی۔

دیکھنے کو تو سب کچھ پہلے ہی کی مانند تھا لیکن اندر ہی اندر سے کوئی چیز ٹوٹ گئی تھی، کوئی گھاؤ لگ چکا تھا سینے کے اندر۔ جولیس سیزر کو تو اپنے دوست کا مارا ہوا ایک پھول بھی پتھر کی طرح لگا تھا اور اس کے منھ سے نکلا تھا۔ 'یو ٹو بروٹ'

انھی دنوں دل ابھی بھی بہت ڈانواڈول تھا، غیر متوازن تھا کہ پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے چٹھی آ گئی کہ پرچے چنڈی گڑھ میں دیکھے جائیں۔ اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ہم کالج کے تین چار پروفیسر یونیورسٹی کے فیکلٹی ہاؤس میں جا ٹھہرے۔ اسی دن شام کو سترہ سیکٹر میں جانے کا پروگرام بنایا۔ فیکلٹی ہاؤس سے ایک ویران پگڈنڈی گرلز ہاسٹل کے آگے سے گزرتی ہوئی کارس پانڈیس کورس کے ڈائریکٹوریٹ کی عمارت کے نزدیک پہنچ جاتی تھی۔ وہاں سے نزدیک ہی مارکیٹ تھی، جہاں سے رکشا یا اسکوٹر مل سکتے تھے۔ ہماری ٹولی جب ڈائریکٹوریٹ کی عمارت کے پاس پہنچی تو میں نے ذرا آگے بڑھ کر ایک رکشا والے کو آواز دی۔ 'ارے رکشا' رکشا والا پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا، مجھے دیکھتے ہی اچک کر گدی پر بیٹھ گیا اور پیڈل مارتا ہوا اپنی رکشا تھوڑا آگے لے گیا۔ 'بات سن، ارے رکشا والے' میرے پاس آ پہنچے اشوک کمار نے اونچی آواز میں بلایا۔ یہ آواز سن کر اس رکشا والا نے پھر پیچھے کی طرف دیکھا۔ اتنی دیر میں چندر پرکاش بھی اس کے نزدیک آ گیا۔ رکشا والا رکشا روک کر پیچھے لے آیا۔ اس کے نیچے اترتے اترتے پیارا سنگھ بھی ہمارے ساتھ آ شامل ہوئے۔

''بھیا، میری آواز سن کر دوڑ کیوں گئے تھے؟'' میں نے ذرا ڈانٹ ڈپٹ کے لہجے میں اسے پوچھا۔

''دوڑنا کہاں ہے، سردار جی، ہم تو ویسے ہی باہر جا رہے تھے، باہر کو۔'' رکشا والا تھوڑا گھبرایا ہوا تھا۔

''جب میں نے آواز دی تو رکے نہیں، لیکن ان کی آواز سن کر تم رک گئے۔'' میرے لہجے میں ابھی بھی تلخی تھی۔

''پھر ہم نے سوچا، اگر گھر کی طرف جانے والی سواری مل گئی تو لے لیں گے''، بھیا

اب کچھ حوصلے میں تھا۔

''ارے بھیا— '' اشوک کمار نے ہنستے ہوئے کہا، ''یہ سردار جی تو چیونٹی تک نہیں مار سکتے، ان سے ڈر کس بات کا؟''

''ہمیں کیا معلوم'' بھتیجے نے بھولے پن میں جواب دیا۔

''البتہ جب کوئی اور کام نہ ہو تو مکھیاں ضرور مار لیتے ہیں۔'' یہ آواز چندر پرکاش کی تھی۔

''آگے سے بھیا'' پیارا سنگھ بھی چپ نہ رہ سکا''تم ہمارے جیسے کو ہی رکشا میں بٹھایا کرو، یہ سکھ بہت خطرناک ہے۔''

ہنستے ہنستے میں اور اشوک کمار اس رکشا میں بیٹھ گئے۔ چندر پرکاش اور پیارا سنگھ نے ایک رکشا اور لے لی۔ ہم نے سترہ سیکٹر کے بیئر بار میں پہنچنا تھا۔ جلدی ہی ہم وہاں پہنچ گئے اور آگے پیچھے بیئر بار کے انڈر گراؤنڈ سیل کی سیڑھیاں اتر گئے۔ اندر ہلکی ہلکی روشنی تھی اور سگریٹوں کا گہرا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ ویسے وہاں عجیب طرح کا دوستانہ ماحول بنا ہوا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہم ٹھیک جگہ پر پہنچ گئے ہوں۔ کنگ فشر کا آرڈر دے دیا گیا۔ پیارا سنگھ نے اپنے ہینڈ بیگ سے وسکی کی چھوٹی بوتل نکالی اور آدھا آدھا پیگ بیئر کے ساتھ بھرے گلاسوں میں ڈال دی۔

''یار، وسکی پہلے گلاسوں میں ڈالنی چاہیے بعد میں نہیں۔'' چندر پرکاش نے کہا۔

ویسے پتا ہی نہیں چلتا کہ کتنی وسکی ڈالی جا چکی ہے''، اشوک کمار نے حامی بھری۔

''پتا کیوں نہیں لگتا''، پیارا سنگھ نے جواب دیا، اپنے ہاتھ ناپے ہوئے ہیں۔ ہاتھ کی پہلی جنبش کے ساتھ آدھا پیگ، دوسری جنبش کے ساتھ پورا پیگ۔''

''واہ واہ— کیا ناپ تول ہے۔'' میرے منھ سے نکلا۔

''اس طرح اور کسی کو کم چاہے دے دے، آپ یہ کم نہیں لیتا''، اشوک کمار نے اپنے گلاس میں سے گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

''آپ کو پتا نہیں، اس چھوٹی بوتل کی بنا پر پیارا سنگھ کو بڑی مشکل آئی''، چندر پرکاش

نے اطلاع دی۔

''ہوا کیا—؟'' اشوک کمار نے پوچھا۔

''ہونا کیا تھا، پروفیسر صاحبان''، پیارا سنگھ نے بیئر کا لمبا گھونٹ لیا ''بس یونیورسٹی کا گیٹ گزرتے ہوئے پھنس چلے تھے۔''

''ذرا کھل کر بات کیجیے نا''، میں نے انھیں تحریک دی۔

''بات بس اتنی سی ہے کہ گیٹ پر سی آر پی ایف نے میرے بیگ کو کھلوا کر دیکھا۔ اس میں دو تین پینٹیں تھیں، دو تین شرٹیں، ایک تولیہ جس میں میں نے ادھیا یعنی شراب کی چھوٹی بوتل رکھی ہوئی تھی، تھیلے میں چار پانچ لیموں رکھے ہوئے تھے۔'' پیارا سنگھ اپنی داستان سنانے لگے۔

''یعنی آپ کی پھنسنے کی پوری پلاننگ تھی''، اشوک کمار نے چسکی بھری۔

''کاہے کی پلاننگ؟'' پیارا سنگھ تھوڑا چہکے، آپ کے لیے ہی لدھیانہ سے ادھیا لے کر چلا تھا کہ آپ کی شام رنگین ہو جائے گی۔ اب یہ چیز بیئر بار میں تمھارے ہی کام آ رہی ہے۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو''، میں نے چھیڑخانی کے انداز میں کہا، اگر پھنستا تو انھوں نے ہی پھنسنا تھا، آپ کا تو کچھ نہیں بگڑنا تھا۔''

''شریف آدمی کو یونہی نہ اکسائے جاؤ''، چندر پرکاش نے موقع بھانپتے ہوئے کہا، انھیں پوری بات کر لینے دو۔''

''پوری بات یہ ہے کہ ایک نے بیگ کو نیچے سے ٹٹولنا شروع کر دیا۔ وہ کہنے لگا، یہ کیا ہے، گول گول؟ میں نے جواب دیا، 'یہ وہ ہے، نچوڑنے والے۔' اتنے میں دوسرا جس نے بیگ کے اندر ہاتھ ڈالا ہوا تھا، پوچھنے لگا، 'یہ کیا ہے؟' میں نے جواب دیا، شام کو پینے والی۔' وہ دونوں ہنس پڑے اور کہنے لگے، 'کوئی بات نہیں، آپ اندر آ جائیے۔' دلچسپ بات یہ کہ پہلا شخص ابھی بھی بیگ کے نیچے سے لیموؤں کو ٹٹولے جا رہا تھا۔'' پیارا سنگھ نے اپنی بات ختم کر کے بیئر کا گلاس منھ سے لگا لیا۔

نے اطلاع دی۔

''ہوا کیا۔۔۔؟'' اشوک کمار نے پوچھا۔

''ہونا کیا تھا، پروفیسر صاحبان''، پیارا سنگھ نے بیئر کا لمبا گھونٹ لیا ''بس یونیورسٹی کا گیٹ گزرتے ہوئے پھنس چلے تھے۔''

''ذرا کھل کر بات کیجیے نا''، میں نے انھیں تحریک دی۔

''بات بس اتنی سی ہے کہ گیٹ پر سی آر پی ایف نے میرے بیگ کو کھلوا کر دیکھا۔ اس میں دو تین پینٹیں تھیں، دو تین شرٹیں، ایک تولیہ جس میں میں نے ادھیا یعنی شراب کی چھوٹی بوتل رکھی ہوئی تھی، تھیلے میں چار پانچ لیموں رکھے ہوئے تھے۔'' پیارا سنگھ اپنی داستان سنانے لگے۔

''یعنی آپ کی پھنسنے کی پوری پلاننگ تھی''، اشوک کمار نے چسکی بھری۔

''کاہے کی پلاننگ؟'' پیارا سنگھ تھوڑا چہکے، آپ کے لیے ہی لدھیانہ سے ادھیا لے کر چلا تھا کہ آپ کی شام رنگین ہو جائے گی۔ اب یہ چیز بیئر بار میں تمھارے ہی کام آرہی ہے۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو''، میں نے چھیڑ خانی کے انداز میں کہا، اگر پھنستا تو انھوں نے ہی پھنسنا تھا، آپ کا تو کچھ نہیں بگڑنا تھا۔''

''شریف آدمی کو یونہی نہ اکسائے جاؤ''، چندر پرکاش نے موقع بھانپتے ہوئے کہا، انھیں پوری بات کر لینے دو۔''

''پوری بات یہ ہے کہ ایک نے بیگ کو نیچے سے ٹٹولنا شروع کر دیا۔ وہ کہنے لگا، یہ کیا ہے، گول گول؟ میں نے جواب دیا، 'یہ وہ ہے، نچوڑنے والے۔' اتنے میں دوسرا جس نے بیگ کے اندر ہاتھ ڈالا ہوا تھا، پوچھنے لگا، 'یہ کیا ہے؟' میں نے جواب دیا، شام کو پینے والی۔' وہ دونوں ہنس پڑے اور کہنے لگے، 'کوئی بات نہیں، آپ اندر آجایئے۔' دلچسپ بات یہ کہ پہلا شخص ابھی بھی بیگ کے نیچے سے لیموؤں کو ٹٹولے جا رہا تھا۔'' پیارا سنگھ نے اپنی بات ختم کر کے بیئر کا گلاس منھ سے لگا لیا۔

اس بات کو لے کر ہم چاروں کے درمیان خوب ہنسی مذاق رہا۔ کچھ لمحوں کے لیے ماحول میں پائی جانے والی تلخی میں کچھ کمی واقع ہوئی۔ اس وقت سبھی کے دلوں میں عجیب سا احساس تھا۔ اچھے بھلے بیٹھے بٹھائے دونوں فرقوں میں بکھیڑا پڑ گیا تھا۔ پہلے بھی ہندوؤں اور سکھوں میں کچھ فرق تھا لیکن اور طرح کا۔ میرا کوئی دوست میرے بعد گھر سے واپس ہو جائے تو میرے بھائی جی کہا کرتے تھے، تمھارا ایک دوست آیا تھا، میں نے تو اس کا نام نہیں پوچھا، میں کہتا تھا 'موٹا تھا یا سردار؟' اب یہی بات ہندو اور سکھ میں بدل گئی تھی۔ ڈاکٹر اقبال نے جب کہا تھا:

آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

تو اس کا مطلب کیا تھا؟ کیا وہ ہندوؤں، سکھوں یا مسلمانوں کے بارے میں سوچ رہے تھے یا پورے ملک کے بارے؟ ہماری سوچ اتنی محدود ہوتی کیوں جا رہی تھی؟ جب یہی شاعر بابا نانک کے متعلق لکھی نظم میں کہتے ہیں:

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مرد کامل نے جگایا خواب سے

تو اس کا مطلب سکھوں کے گورو سے تھی کہ پورے دیش کو غفلت کی نیند سے بیدار کرنے والے سے تھی؟ اس زنکاری جوت نے بھی تو کہا ہے 'نہ میں ہندو، نہ مسلمان'۔

''کس سوچ میں گم ہوگئے، پروفیسر بلبیر؟'' چندر پرکاش نے میرے کان میں کہا۔

''گلاس خالی کرو، یار''، پیارا سنگھ ادھیا ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھے۔

''بس، یہی کمی ہے، ان میں۔ پاس بیٹھے ہوئے بھی کہیں دور نکل جاتے ہیں''، اشوک کمار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا، اب اگلا پروگرام کیا ہے؟'' گلاس کو خالی کرتے ہوئے میں نے انھیں پوچھا۔

''اگلا پروگرام کسی بڑھیا ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے کا ہے''، چندر پرکاش نے جواب میں کہا۔

''بڑھیا سے آپ کا مطلب، مہنگے ریسٹورنٹ سے ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اتنا مہنگا بھی نہیں ہوگا کہ یونیورسٹی سے پیپر مارک کرنے کا جو چیک ملتا ہے، اسے ہماری اس شنے کا خرچہ بڑھ جائے''، پیارا سنگھ نے شرارتی لہجے میں کہا۔

''ویسے ہم نے اس بات کا بھی خیال رکھنا ہے''، چندر پرکاش نے اپنے خیالات کا اظہار کیا، ''کہ گھر لے جانے کے لیے کچھ بھی نہ بچے۔''

اس بات پر سبھی ہنس پڑے اور آدھے آدھے گلاس پھر بھر دیے گئے۔ کھانے کے لیے پہلے پٹیٹو چپس منگوائے گئے تھے، اب بیرے کو چیز فنگرز کے لیے آرڈر دیا گیا۔ ہمارے اردگرد شور شرابہ اور بڑھ گیا لیکن پہلے کی طرح اب یہ شور ہمیں برا نہیں لگ رہا تھا۔ بیئر کی بوتلوں کے آپس میں ٹکرانے کی آواز کسی پیانوں کے سُر کی طرح تھی۔ اس طرح لگ رہا تھا جیسے یہ سب لوگ 'دیر و کعبہ' میں سے نکل کر خرابات میں پہنچ گئے تھے۔ ان سب کو سکون کی تلاش تھی اور اس ہنگامے نے ان کے اندر کے شور کو کچھ وقت کے لیے دبا دیا تھا۔ سبھی اسی کام میں مصروف نظر آتے تھے کہ ان کے سروں پر جو آندھی جھول رہی تھی، وہ کسی نہ کسی طرح ٹل جائے، نکل جائے کسی سمت۔ یہاں انڈر گراؤنڈ سیل میں، وقت تھم گیا معلوم ہو رہا تھا۔ وقت کا اس جگہ پر نہ آغاز تھا اور نہ ہی اختتام بس وہ ایک ہی جگہ پر تھم چکا تھا۔ لوگ آواگون کے سلسلے کی طرح سیڑھیاں چڑھ رہے تھے، اتر رہے تھے۔ زمین کے نیچے محفل آراستہ تھی، اگر یہاں کسی کو آپس میں کوئی رنجش نہیں تھی تو پھر زمین پر اتنا شور شرابہ کیوں تھا۔ یہ کسی کو پتا نہیں تھا کہ کس نے کھڑے پانی میں زہر گھول دی تھی لیکن بے بس ہو کر سب لوگ اس پانی کی بوند بوند پینے کے لیے مجبور تھے۔

''چلو گلاس خالی کرو اور چلیں''، یہ مشورہ چندر پرکاش کی طرف سے تھا۔

''پہلے یہ تو بتاؤ کہ چلنا کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نرول ریسٹورنٹ میں چلیں گے''، اشوک کمار نے بات کو واضح کیا۔

''پہلے باہر چل کر تھوڑی تھوڑی وسکی اور پیتے ہیں''، یہ آواز پیارا سنگھ کی تھی۔

باہر دنیا ہی اور تھی، جیسے یہ ماحول اصلی نہ ہو، بلکہ پری کہانیوں والا ہو۔ مرکری لیمپوں کی روشنی میں گھوم پھر رہے یہ لوگ نشے کی زندگی میں دکھائی دے رہے تھے۔ تھوڑا

آگے گئے تو انگریزی شراب کی دکان کے آگے ہمارے قدم خود بخود رک گئے۔ پیارا سنگھ نے ادھیالیا اور ہم بھی تھوڑا اندھیرے میں پیومنٹ پر ہی ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئے۔ چندر پرکاش چواڑی سے دو سوڈے کی بوتلیں اور چار گلاس لے آئے۔ دوسرا دور شروع ہوگیا۔ ہمارے سامنے عجیب منظر تھا۔ اس وقت سترہ سیکٹر میں پوری رونق تھی۔ لوگ جیسے میٹھی دھن کے سہارے ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے۔ ویسے چاہے ان کی حرکتوں میں کوئی تال میل نظر نہیں آرہا تھا، لیکن ذرا سا نشیلی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھا ترتیب میں بندھا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک سرور، ایک نغمہ، جل ترنگ، جھرنے کی لے، درختوں میں سے گزر رہی ہوا کی شائیں شائیں، قمقموں کی روشنی، نیونوں کی، بلبوں کی، بچوں کی کلکاریاں، عورتوں کی خوش گپیاں، مردوں کی نظروں کو خوب سے خوب تر کی تلاش — فواروں والے اس تالاب میں ستارے اتر آئے لگتے تھے۔

''اس طرح نہیں لگتا تمھیں جیسے ہم نے کوئی طلسمی ٹوپی پہنی ہوئی ہو اور ہمیں کوئی نہ کوئی دیکھ رہا ہو، جبکہ ہم سب کچھ دیکھ رہے ہوں''، میں نے یہ بات کہتے ہوئے اپنے گلاس میں سے وسکی کا بڑا سا گھونٹ بھرا۔

''لگتا تو اس طرح ہی ہے لیکن ہمیں دیکھنے والے بھی کسی کونے میں بیٹھے ہوں گے۔'' پیارا سنگھ نے یونہی کہا۔

''آپ دونوں کو لوگ دیکھ رہے ہوں گے کہ راجدھانی میں کہیں کوئی شرارت ہی نہ کر دیں۔'' چندر پرکاش نے اپنے گلاس اٹھالیا۔

''یہ دونوں اگر شرارت کرنے کے لائق ہوتے تو یہاں سڑک کی پٹری پر ہی بیٹھتے، کہیں فائیو اسٹار ہوٹل میں عیش نہ کر رہے ہوتے؟'' اشوک کمار نے ذرا شرارتی لہجے میں کہا۔

''بات سنو یارو''، میں جیسے سرور میں آچکا تھا، ''اردو کے مشہور شاعر ن م راشد کی ایک نظم ہے — 'شرابی' بہت پہلے لکھی ہوئی ہے لیکن آجکل کے حالات کے عین مطابق ہے۔''

''یاد ہو تو سنائیں'' اشوک کمار نے ٹانگیں اور پھیلا لیں۔

''کوشش کرتا ہوں۔ کسی زمانے میں یہ نظم میں اپنے کالج کے ٹیوٹوریل گروپوں کی میٹنگوں میں سنایا کرتا تھا''، میں نے کچھ سوچنے کے انداز میں جواب دیا۔

''بڑی دلچسپ بات ہے بلبیر سنگھ''، چندر پرکاش نے اپنے دل کی بات کرتے ہوئے کہا، ''کہ آپ سکھ ہو کر ہندو کالج میں پڑھتے اور میں ہندو ہو کر خالصہ کالج میں۔''

''یار، پھر آپ نے وہی باتیں شروع کر دیں — ہندو سکھ یا سکھ ہندو۔ انسانوں کی بات کرو، انسانیت کی بات کرو، تعلیم کے پھیلاؤ کی بات کرو، پیار اور محبت کی بات کرو''، اشوک کمار شاید لیکچر دینے کے موڈ میں آ گئے تھے۔

''باتوں باتوں میں کہیں وہ نظم بیچ میں ہی نہ رہ جائے''، پیارا سنگھ تھوڑا جلدی میں تھے۔

''کیا نام ہے اس کا؟'' اشوک کمار نے پوچھا۔

''نام میں کیا رکھا ہے''، چندر پرکاش نے جواب دیا۔

''رکھا تو سب کچھ ہے''، پیارا سنگھ نے اپنی عینک کے موٹے شیشوں میں سے جھانکتے ہوئے کہا، ''بلکہ آجکل تو نام میں ہی سب کچھ ہے۔ 'کمار' کی جگہ پر 'سنگھ' لگا دو، پھر دیکھو لوگوں کی نظروں میں کتنا فرق پڑتا ہے۔''

''یہ بات چھوڑو اور میری نظم سنو''، میں نے اس بات کو ٹالنے کی کوشش میں کہا۔

''یہ نظم میں اپنی بیوی کو کئی مرتبہ سنا چکا ہوں، خاص کر اس وقت جب وہ میرے ساتھ مالی بدحالی کے گلے شکوے کرنے لگ جاتی ہے۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے — اگلی بات کرو؟'' پیارا سنگھ چہچہایا۔

''اگلی بات سنو''، میں نے اپنے گلاس میں سے آخری گھونٹ بھرا۔

شکر کر اے میری جاں کہ میں
ہوں درِ افرنگ کا ادنیٰ غلام
اور بہتر عیش کے قابل نہیں

''معاف کرنا، بلبیر سنگھ''، چندر پرکاش نے ٹوکا، ''اب ہم فرنگی کی جگہ پر براؤن صاحب جیسا کوئی لفظ لگالیں تو ٹھیک ہے۔''

''یوں بھی ٹھیک ہے''، اشوک کمار نے اپنے ہاتھ سے گلاس رکھ دیا۔

''ارشاد، ارشاد — ''، پیارا سنگھ کی نظر مجھ پر تھی۔

''ہاں تو صاحبان، میں کہہ رہا تھا — ''، میں نے ان کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

''پنجابی میں — ''، پیارا سنگھ نے ٹوکا۔

''نظم جو اردو میں ہے''، میں نے ان کی طرف دیکھا۔

''ٹھیک ہے — پھر ٹھیک ہے''، پیارا سنگھ نے اپنا گلاس حلق کے اندر اتار لیا۔

''نظم ہے — ''، میں نے موڈ میں آتے ہوئے کہا —

آج پھر جی بھر کے پی آیا ہوں
دیکھتے ہی تری آنکھیں شعلہ ساماں ہوگئیں
شکر کر اے جاں کہ میں
ہوں درِ افرنگ کا ادنیٰ غلام
غم سے مر جاتی نہ تو
آج پی آتا جو میں
جامِ رنگیں کی بجائے
بیکسوں اور ناتوانوں کا لہو
شکر کر اے جاں کہ میں
ہوں درِ افرنگ کا ادنیٰ غلام
اور بہتر عیش کے قابل نہیں

یہ نظم سننے کے بعد سب کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئے۔ پھر، وہاں سے اٹھ کر ہم 'غزل' ریسٹورنٹ میں چلے گئے۔ کھانا کھاتے وقت ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس

وقت رات کے دس بج چکے تھے۔ ہم نے یونیورسٹی کے فیکلٹی ہاؤس میں پہنچنا تھا۔ باہر آ کر ہم نے دو رکشا لے لیں۔ یونیورسٹی کے بیرونی گیٹ تک تو وہ ہمیں لے گئے لیکن انھیں اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ سی آر پی ایف کا پہرہ بہت سخت تھا۔ شرارتی عناصر پر نظر رکھنی بہت ضروری تھی۔ شرارتی عناصر کی ایک ہی شکل وصورت تھی۔ اس لیے ایک ہی شکل وصورت پر نظر رکھنے کا مطلب تھا، شرارتی عناصر پر نظر رکھنا۔

''آپ اپنی رکشا آگے کر لیں'' یونیورسٹی کے گیٹ سے تھوڑا پہلے ہی پیارا سنگھ نے اشوک کمار اور چندر پرکاش سے کہا۔

واپسی پر وہ دونوں ایک رکشا میں بیٹھ گئے۔ اس طرح بے خیالی میں ہی ہو گیا تھا، ورنہ یہ کوئی عقلمندی والی بات نہیں تھی۔ عقلمندی والی بات مل جل کر بیٹھنا، میرا مطلب ہے آپس میں مل جل کر بیٹھنا، یہ نہیں کہ دونوں ایک جیسے ایک رکشا میں اور دوسری طرح کے دونوں دوسری رکشا میں خیر — جو ہونا تھا، ہو چکا تھا۔ اتنا ضرور تھا کہ دونوں رکشا ایک ہی وقت میں گیٹ کے پاس پہنچیں اور رکشا چلانے والے بھیجے جلدی ہی اپنی گدیوں سے نیچے اتر کر سہمے ہوئے ایک طرف کھڑے ہو گئے —

''کہاں جانا ہے؟''

''فیکلٹی ہاؤس''

''پاس دکھاؤ''

''پاس تو ابھی بنے نہیں۔''

''کوئی چٹھی چتر — ؟''

''وہ بھی نہیں۔''

''آئیڈینٹیٹی کارڈ؟''

''ہاں — وہ ہے''

''ٹھیک ہے — آپ اندر جائیے، تاہم رکشا نہیں جائے گی۔''

بیرونی گیٹ سے لے کر فیکلٹی ہاؤس تک کا راستہ ہم نے خاموشی سے کاٹا۔ گرلز ہوسٹل کی آدھی بتیاں بجھ چکی تھیں۔ ایک طرف درختوں کے پیچھے سوکھے پتوں میں کچھ سرسراہٹ سی ہوئی۔ ہم سبھی کا دھیان ادھر چلا گیا۔ ایک گیدڑ دوڑتا ہوا، دوسری طرف چلا گیا۔ درختوں کی پرچھائیاں ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے میں مل گئیں۔ ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھے بغیر مسکرا دیے۔ مجھے بہت سال پہلے پڑھا ہوا فارسی کا ایک شعر یاد آ گیا، جس میں شیخ سعدی کہتے ہیں کہ دمشق میں اتنا قحط پڑا کہ لوگ عشق کرنا بھول گئے:

چناں قحط شد اندر دمشق
کہ یاراں فرو گذاشتن دمشق

اگلے روز صبح ایڈمنسٹریٹو بلاک کے گیٹ پر ہر اندر داخل ہونے والے کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ یونیورسٹی کا واچ اینڈ وارڈ عملہ وہاں تعینات تھا۔ ان میں زیادہ تر ریٹائرڈ سکھ فوجی تھے۔ وہاں سے تھوڑے فاصلے پر سی آر پی ایف کے جوان کھڑے تھے۔ میں جب اس ٹولی کے پاس سے ہو کر گزرا تو ان کی نظریں مجھ پر اور گہری ہو گئیں۔ میں ان کی طرف ترچھی نظروں کے ساتھ دیکھتا ہوا آگے گزر گیا۔ میرے ساتھ آ رہے اشوک کمار اور چندر پرکاش سگریٹ پینے کی خاطر پیچھے ہی رک گئے تھے۔ پیارا سنگھ ناشتہ کرنے کے بہانے کچھ دیر کمرے میں چلا گیا تھا۔ میں جب گیٹ کے آگے آیا تو واچ اینڈ وارڈ کے عملے میں سے ایک نے مجھے روکتے ہوئے پوچھا۔

"کیا ہے اس ہینڈ بیگ میں؟"

"آپ خود بخود دیکھ لیں —" میں نے بیگ کی زپ کھول دی۔

"منہ سے بتانے میں کوئی فرق پڑتا ہے؟" ایک اور اسی طرح کا ریٹائرڈ سکھ فوجی میری طرف آیا۔

"پھر بھی تو آپ نے اس بیگ کی تلاشی لینی ہی تھی"، میں نے ذرا اکڑ کر جواب دیا۔

''یہ کیا بات ہوئی، ہم اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے ہیں''، ریٹائرڈ فوجی نے دھونس جمائی۔

''پھر سبھی کی تلاشی لیں، یہ ٹھیک نہیں کہ کسی کو روک لیا اور کسی کو جانے دیا۔'' میں بھی طیش میں آ گیا۔

''یونہی نہ جو منھ میں آئے بولتے جاؤ — ہم تو عورتوں کے پرس تک کی تلاشی لے لیتے ہیں۔'' ایک اور آدمی اپنی ٹوپی سیدھی کرتے ہوئے میرے پاس آ گیا۔

اتنے میں دو ملازم عورتیں گیٹ کے نزدیک آئیں، ان کے پرس کھلوا کر دیکھے گئے۔ پھر اشوک کمار اور چندر پرکاش بھی وہاں پہنچ گئے۔ ان کی بھی تلاشی لی گئی۔ اتنے میں انھوں نے مجھے گیٹ پر کھڑے ہوئے دیکھ لیا۔

''پروفیسر بلبیر، آپ ابھی تک اوپر نہیں پہنچے؟'' اشوک کمار نے حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں — انھوں نے مجھے روک رکھا ہے''، میں نے شکایت کی۔

''آپ کو کس نے روکا ہے؟ بات کیا ہے؟ چندر پرکاش نے میرے بازو کو پکڑ لیا۔

''لو، پیارا سنگھ بھی آ گئے ہیں، اب چنڈال چوکڑی پوری ہو جائے گی''، اشوک کمار چہچہایا۔

''مجھے پتا تھا بلبیر سنگھ نے یہاں بھی کوئی اڑچن ڈالی ہوگی، یہ یونہی رہ نہیں سکتے''، پیارا سنگھ نے اپنے ہینڈ بیگ کو کھول کر سیکورٹی والوں کے آگے کرتے ہوئے کہا۔

ان کی بھی اچھی طرح تلاشی لیں، یہ کئی چیزیں اپنی پگڑی میں چھپا لیتے ہیں۔'' میں نے پیارا سنگھ کو چڑانے کی خاطر کہا۔

اس بات پر سیکورٹی والے بھی ہنس پڑے۔ ہم چاروں فوائر میں سے گزرتے ہوئے اوپری سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ میں جان بوجھ کر پیچھے رہ گیا تھا۔ شاید میں ہی اس زمانے میں غلط تھا؟ سوچو مت، جو کچھ ہوتا ہے ہونے دو۔ بس، اپنی چمڑی کو بچاؤ۔ آنے والی

نسلیں آپ پر ناز کریں گی۔ میرے اردگرد سیڑھیاں چڑھ رہے تھے، لوگ سیڑھیاں اتر رہے تھے لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ہی اس صحرا میں اکیلا ہوں۔ لوگوں کی اس بھیڑ میں میں ہی اجنبی تھا۔ پتا نہیں یہ لوگ کون تھے اور کہاں سے آئے تھے؟ یہ کوئی بھی ہوں، لیکن اب تو یہی پنجاب کی اس سرزمین کے چپے چپے کے، اس کیمپس کے بوٹے بوٹے کے اور علم کی اس کیاری کے پتے پتے کے مالک تھے۔

12

آنکھ کھلتے ہی میں نے محسوس کیا کہ میرا سارا بدن پسینے کے ساتھ بھیگا ہوا تھا۔ پتا نہیں کیوں گزشتہ سال کی باتیں خواب بن بن کر یاد آرہی تھیں۔ میں اٹھ کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ کمرے کے نیم کھلے دروازے میں سے صحن کا ایک حصہ نظر آرہا تھا۔ چاند کی ایک شعاع صحن کے اس حصے کو منور کر رہی تھی۔ وہاں سے اٹھ کر میں باہر آگیا۔ اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ چپہ بھر آسمان پر مٹھی بھر تارے بکھرے ہوئے تھے۔ مجھے صحن میں کھڑے ہوئے ممٹی کے پیچھے چاند کا ایک حصہ یوں نظر آرہا تھا جیسے کوئی کسی سے چھپ رہا ہو یا کسی کو چھپ چھپ کر دیکھ رہا ہو۔ وہاں کھڑے کھڑے مجھے عجیب طرح کا احساس ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں زمان و مکان سے اوپر اٹھ گیا ہوں۔ یا پھر کسی تاریک گپھا میں رہ رہا ہوں۔ یہ گھر، یہ کوچہ، یہ بازار، یہ کٹرہ، یہ شہر — کیا رشتہ تھا میرا ان سب کے ساتھ؟ ہونا تو یہی تھا نا کہ:

کدھر سے آئی باد شب کدھر کو گئی

خیالوں کا قافلہ بڑی تیز رفتاری کے ساتھ چل رہا تھا۔ 'میری دھرتی، میرے لوگ' کہنے والے اب کہاں تھے؟ نہ یہ دھرتی، نہ یہ لوگ۔ دھرتی پر لکیریں ڈالی جارہی تھیں، لوگ تقسیم کیے جارہے تھے۔ یہ اپنے یہ پرائے۔ تنگ نظری کا بول بالا تھا، ذاتی خودغرضی کی جیت تھی۔ جانبداری کا عروج تھا۔

باتھ روم میں گیا تو کاکروچوں کی وہی ریل پیل دیکھی۔ اندھیرے کے یہ متوالے بتی کی روشنی میں ادھر ادھر بھاگ گئے۔ میرے اردگرد عجیب طرح کی بے چینی کا عالم تھا۔ باتھ روم سے واپس آکر میں صحن میں پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کرسی کو تھوڑا آگے

کرنے لگا تو کرسی کا ایک بازو میرے ہاتھ میں آ گیا۔ ایک عرصے سے اس کرسی کا یہی حال تھا، جلدی سے میں نے وہی بازو ٹھیک جگہ پر لگا دیا۔ سامنے دیوار پر گھر کی گھڑی ایک بجا رہی تھی میں نے اپنے اردگرد دیکھا چاروں طرف سناٹا تھا۔ گلی کی جانب والا کمرہ گویا اونگھ رہا تھا۔ اس کمرے میں صرف چوکھٹ لگی ہوئی تھی، دروازہ نہیں۔ اسی کمرے میں جھائی جی نے آخری سانس لی تھی۔ بعد میں اسی کمرے میں باؤجی کا دیوان لگ گیا تھا۔ بیتی یادوں کے سہارے وہ کئی سال اس دیوان پر بیٹھے یا لیٹے ہوئے کاٹ گئے۔ اب اس دیوان پر کبوتروں کے پر بکھرے ہوئے تھے۔ کوئی بلی کبوتر پکڑ کر آرام کے ساتھ یہاں آ بیٹھتی تھی۔ جاتے وقت وہ پیچھے صرف پر چھوڑ جاتی تھی — نہ کوئی ہڈی کا ٹکڑا نہ خون کا دھبہ۔

اچانک مجھے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی:

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو

تین صدیوں پہلے کا مطلب تھا۔ تاریخ کے تین ورق، زمانے کی پچھلی طرف تیسری کروٹ —

'آگے آگے سکھ اور پیچھے لکھپت، بسوہلی کی پہاڑیوں کی طرف ہو چلے۔ سکھوں کا خیال تھا کہ پہاڑی ہندو اس دھرم یدھ میں — جو مغل دور کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے شروع کیا گیا تھا — ہماری مدد کریں گے، لیکن وہ یہ نہ سمجھے۔ لکھپت نے ان پہاڑی ہندوؤں کو پہلے ہی اپنی طرف گانٹھ لیا تھا اور سرکار کے تحت احکام بھی بھیج رکھے تھے کہ کوئی سکھ بچ کر نہ نکلے۔ سکھوں کی مدد کرنے والے کو سزائے موت اور مارنے والوں کو انعام۔ یہ حکم پہاڑیوں کے کانوں تک پہنچ چکا تھا۔ اس طرح ہزاروں پہاڑی لوگ سامنے سے ہتھیار لے کر سکھوں سے لڑنے کے لیے آ کھڑے ہوئے۔ سکھوں نے سمجھا کہ یہ ہماری مدد کے لیے آئے ہیں۔ ان کو پتا تب لگا جب پہاڑیوں نے ان کو پکڑ لیا اور پیچھے آنے والوں پر گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ یہی حال ان سکھوں کا ہوا جو پڈول اور کٹھوعہ کی پہاڑیوں کے اوپر چڑھے تھے۔ سکھوں کو اب پتا چلا کہ ہم بری طرح پھنسے ہیں۔

اس وقت مجھے اپنے گھر کے اندھیرے صحن میں بیٹھے ہوئے یہ باتیں یاد آ رہی تھیں۔

کئی سال پہلے تاریخ کی کتاب میں پڑھی ہوئیں یہ باتیں مجھے کل کی باتیں معلوم ہو رہی تھیں۔ لکھپت نے اپنے ہم وطنوں پر ظلم کیے تھے اور اس کا بدل بھی تاریخ نے پیش کر دیا تھا۔ دیوان کوڑا مل کے دل میں سکھوں کے تئیں بڑی عزت اور پیار تھا—

ملتان سے تین کوس باہر لڑائی ہوئی۔ شاہ نواز کوڑا مل کی فوجوں کو دبائے چلا آ رہا تھا۔ کوڑا مل نے سردار جسا سنگھ اہلووالیہ کو کہا، "پنتھ کے ہوتے ہوئے بھی میری ہار ہو جائے، تو میں اور کس کا سہارا ڈھونڈوں؟" یہ سن کر سکھوں کو جوش آیا۔ جسا سنگھ کی گولی کے ساتھ شاہ نواز نیچے آ گرا۔ اس کی فوجیں بھاگ گئیں۔ یہ واقعہ ستمبر یا اکتوبر 1749 کا ہے۔ سارے ملتان پر کوڑا مل نے قبضہ کر لیا۔ میر منو نے کوڑا مل کو 'مہاراج بہادر' کا خطاب دے کر ملتان کا صوبے دار نامزد کر دیا۔

کوڑا مل گورو گھر کا بہت عقیدت مند تھا۔ اس جیت کی خوشی میں اس نے گیارہ ہزار روپے امرتسر دربار صاحب کے نذر کیے اور تین لاکھ روپے خرچ کر کے ننکانہ صاحب گورودوارہ بال لیلا اور اس کے ساتھ سروور بنوایا۔ وہ سکھوں کی خدمت بڑے پیار کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ سکھ اس کو پیار میں 'میٹھا مل' کہا کرتے تھے۔

اب یہ سب باتیں یاد کر کے میرا دل فخر محسوس کرنے لگا۔ ایک طرف تو لمحوں تک جینے والے لوگ تھے، دوسری طرف صدیوں تک یاد آنے والے۔ اتہاس کی اس کتاب کے کچھ اور اوراق میری آنکھوں کے سامنے پھڑپھڑائے اور ایک صفحہ کی عبارت میرے ذہن میں ابھر آئی—

اس گھلوگھارے (5 فروری 1762) میں سکھوں کا بڑا نقصان ہوا۔ ان کی شکست کی سب سے بڑی وجہ جم غفیر کا ساتھ ہونا تھا۔ زیادہ فکر انھیں جم غفیر کو بچانے کی تھی۔ دوسری وجہ ابدالی کے پاس توپ خانے کا ہونا تھا۔ سکھوں کا سارا سامان لوٹا گیا۔ آلا سنگھ پٹیالہ نے اس لڑائی میں کسی بھی گروہ کی مدد نہیں کی تھی۔ وہ پٹیالہ سے سترہ میل دور بیٹھا تھا۔ ابدالی نے اسی غصے میں کہ آلا سنگھ حاضر کیوں نہیں ہوا، برنالہ کا قلعہ مسمار کر دیا اور علاقہ لوٹ لیا۔ اس نے آلا سنگھ کو پکڑنے کے لیے فوج بھیجی لیکن وہ خود ہی حاضر ہو گیا۔ ابدالی نے اسے

گرفتار کرلیا اور کیس کٹوانے کا حکم دیا۔ آلا سنگھ نے سوا لاکھ بطور نذرانہ دے کر اپنے کیس کٹوانے سے بچا لیے۔

15 فروری 1762 ابدالی سرہند سے روانہ ہوا اور امرتسر کے قلعہ رام گڑھ میں جا بیٹھا۔ ہرمندر صاحب کی بنیادوں کے نیچے بارود دبا کر اسے مسمار کر دیا۔ سرو ور کو بھروا دیا۔ سرو ور کو اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ نقصان پہنچایا گیا تھا، لیکن ہرمندر صاحب کو بنیادوں تک ابدالی نے ہی اس مرتبہ گرایا تھا۔ پنتھ کی طرف 17 نومبر 1763 کو ہرمندر صاحب کی دوبارہ بنیاد رکھی گئی۔ نواب کپور سنگھ نے اینٹ رکھی اور جسا سنگھ آہلووالیہ نے چونا ڈالا۔ ٹھیک اسی وقت خبر ملی کہ درّانی جرنیل جہان خاں فوج سمیت اٹک پار کر آیا ہے۔ ہرمندر صاحب کی تعمیر کا کام بھائی دیس راج سرسنگھ والے کے سپرد کر کے سنگھ درّانی سے ٹکرانے کی غرض سے اسی طرف چل دیے۔

اپنے گھر کے صحن میں بیٹھا میں اندھیرے کو اور گہرا ہوتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ میرے لیے جیسے وقت کی گاڑی رک گئی تھی۔ یہ گڑھے میں پھنسے گڈے (چھکڑے) کی طرح بے حرکت کھڑا تھا۔ یا خدا! اس رات کی صبح کب ہوگی؟ ہوگی بھی یا نہیں؟ اس گھپ اندھیرے میں میرا دم گھٹ رہا تھا۔ قطرہ قطرہ زہر میرے حلق میں اتر رہا تھا۔ مریض میری آنکھوں کے سامنے تڑپ رہا تھا۔ بڑا ساز وسامان لے کر آئے تھے، مسیحے۔ انھوں نے مریض کی گھیرابندی کر لی تھی۔ ہر لمحہ اس کے اور نزدیک ہوتے جا رہے تھے، یہ مسیحے۔ ضرورت اسے کھلی ہوا میں سانس لینے کی تھی لیکن اسے ضابطوں میں جکڑا جا رہا تھا۔

صحن سے اٹھ کر میں اندر کمرے میں چلا گیا۔ بتی روشن رکھ کر ہی میں بستر پر لیٹ گیا۔ میں بہت نڈھال ہو چکا تھا۔ کسی زمانے میں سوچا تھا کہ پہلے صوبائی حدود سے اوپر اٹھیں گے، پھر ملکی حدود کو نظرانداز کریں گے۔ اور آخر میں دنیا کے شہری بننے کی خوش قسمتی حاصل ہوگی۔ دنیا کے باشندوں کے ساتھ ایک تعلق پیدا ہوگا۔ یہ بھی روحانی قسم کا نہیں بلکہ انسانی قدر و قیمت کی بنیاد پر۔ لیکن اب جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ ان باتوں کے بالکل برعکس تھا۔ تنگ نظری نے یہ مسئلے اور الجھا دیے تھے۔ نیتا لوگ اس عظیم ملک کے باشندوں کو

دلاسہ دے رہے تھے۔ مجھے خیال آیا کہ میں بھی اسی طرح اپنے باؤجی کو، جب وہ میری معاشی حالت کی طرف اشارہ کیا کرتے تھے، دلاسہ دیا کرتا تھا۔

''تمھارے ساتھیوں نے کوٹھیاں تعمیر کر لی ہیں، بڑے عہدوں پر جا بیٹھے، لیکن تمھارا وہی حال رہا''، باؤجی قدرے غصے میں کہتے۔

''آپ کو پتا ہی ہے میں کسی کی خوشامد نہیں کر سکتا اور نہ ہی میں اپنی خودداری کو چھوڑ سکتا ہوں''، میں اپنی بات کو باوزن بنانے کی کوشش کرتا۔

''ٹھیک ہے، بیٹا، لیکن زمانے کے ساتھ چلنا چاہیے لوگوں کے ساتھ تعلقات بنا کر رکھنے چاہئیں — ملنا جلنا بہت ضروری ہے''، وہ دلیل دیتے۔

''مجھے تو صرف اپنی چھوٹی موٹی عقل پر ہی بھروسہ ہے اور میں کچھ نہیں جانتا''، یہ بات کہتے ہوئے میں اندر ہی اندر جھینپ جاتا۔

''کچھ چیزیں انسان کو نئی بھی سیکھ لینی چاہئیں''، باؤجی نرم لہجہ میں کہتے۔

''کوشش کروں گا، باؤجی، کچھ نئی باتیں سیکھنے کی''، میں بات کو ختم کرنے کی غرض سے جواب دیتا۔

''ویسے، بیری انسان سیکھتا وہی کچھ ہے، جس کام میں اس کی دلچسپی ہو''، باؤجی میرے تئیں زیادہ امیدیں رکھنا چاہتے تھے۔

''بچپن میں آپ نے میری دلچسپی صرف پڑھائی میں پیدا کر دی تھی، کسی اور چیز میں نہیں۔'' میں جلدی اپنی شکست ماننا نہیں چاہتا تھا۔

''ٹھیک ہے اب تم کتابیں لکھتے رہو اور کتابیں پڑھتے رہو۔ تم روپیہ نہیں کما سکتے۔ اگر خاص کوشش کرو، تب بھی نہیں''، باؤجی اپنا فیصلہ سنا کر چلے جاتے۔

''میں شرمندہ سا ہو کر کتنی کتنی دیر وہاں بیٹھا رہتا۔ مجھے باؤجی کی سب باتیں ٹھیک معلوم ہوتیں اور اپنی سب باتیں من گھڑت۔ اپنی نالائقی چھپانے کی خاطر میں کتابوں کو درمیان میں لے آتا، خودفریبی کے ساتھ ساتھ گھر والوں کو بھی فریب دینے والی بات تھی۔ دوسروں کے ساتھ معمولی سی بات پر جھگڑا کرنا میری عادت میں شامل تھا۔ میری اسی

عادت نے مجھے کسی ایک جگہ پر زیادہ دیر ٹکنے نہیں دیا۔ سال کہیں، دو سال کہیں، پانچ سات سال کہیں۔ اسی طرح میرا سارا وقت گزر گیا تھا۔ سمجھ داروں نے ایک ہی جگہ پر جم کر ٹیوشنوں کا انتظام کرلیا تھا یا امدادی بکس لکھنے کا دھندہ ڈھونڈ لیا تھا۔ زیادہ چست لوگوں نے فیکٹریاں لگالیں، پلاٹ خرید لیے اور پراپرٹی ڈیلر بن بیٹھے۔ پیسہ کمانے کے چکر میں آدمی کو نہ تو اپنے تئیں اور نہ ہی دوسروں کے تئیں مخلص ہونے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ناپ تول انسانی قدر و قیمت کا نہیں، نفع نقصان کا ہوتا ہے۔ نوکری کرتے وقت چاپلوسی کی بڑی قدر پڑتی ہے، لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ساری عمر ہوشیاری سے کام نہیں لیتے۔

''پرنسپل صاحب، پتا لگا ہے کہ کل شام آپ نے ڈراما شروع ہونے سے پہلے روپا کے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگائی تھی۔''

''بات اس طرح ہوئی، پروفیسر بلبیر سنگھ کہ اس نے لپ اسٹک ٹھیک طرح سے نہیں تھی لگائی اور ڈراما شروع ہونے میں صرف پانچ منٹ رہتے تھے۔''

''اس وقت آپ کے ساتھ مس براؤ بھی تھیں، آپ یہ کام انھیں کہہ دیتے۔''

''پروفیسر صاحب، آپ خواہ مخواہ میرے پر شک کر رہے ہو، آپ کو کسی نے بہکایا ہے۔''

''یہ بات میں ہی نہیں کہہ رہا، پرنسپل صاحب، سارا اسٹاف کہہ رہا ہے، سارے طالب علم کہہ رہے ہیں۔''

''لیکن میرے پاس تو آپ ہی خصوصی طور پر آئے ہو۔''

''اس لیے کہ میں اسٹاف سکریٹری ہوں، مجھے انھوں نے ہی آپ کے پاس آنے کے لیے کہا ہے۔ ویسے میں ایک بات واضح کر دوں، پرنسپل صاحب، جو کچھ ہوا ہے، ٹھیک نہیں ہوا۔''

ٹھیک ہوا تھا یا غلط، اس کے متعلق کسی اور نے زیادہ فکر نہیں کی۔ ہاں، میری ٹرانسفر ضرور ہوگئی۔ ہفتہ دس دنوں کے اندر ہی۔ اچھی بھلی جگہ سے پسماندہ علاقہ میں پھینک دیا گیا، جن پروفیسروں نے مجھے الٹی سیدھی پٹی پڑھا کر پرنسپل کے پاس بھیجا تھا وہ خوش تھے

کہ تبادلہ صرف میرا ہوا تھا، ان میں سے کسی اور کا نہیں۔ جلدی ہی وہ سب پروفیسر، پرنسپل کے بہت نزدیک ہو گئے۔

جیسے تیسے نئی جگہ پر میں نے اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرلیا۔ بچوں کی پڑھائی کا نقصان ہوا، تھوڑا بہت جو کچھ ریٹی ڈے نے کے لیے جمع کیا تھا بیکار چلا گیا۔ نیا کالج، نیا اسٹاف، نئے طالب علم۔ ازسرنو ڈھنگ سے کام شروع ہوا، کچھ وقت ٹھیک طرح سے گزر گیا۔ سوچا تھا کہ یہاں سکھ کی سانس ملے گی اور کچھ حاصل بھی ہوگا کہ ایک نئی مصیبت نازل ہوگئی —

"مجھے پتا لگا ہے کہ اس اسٹرائیک میں آپ کا ہاتھ ہے؟"

"کمال کرتے ہو، پرنسپل صاحب میں اس طرح کی حرکت نہیں کرسکتا۔"

"میرا وسیلہ نہایت قابل اعتماد ہے۔ کیا یہ بات ٹھیک نہیں کہ ہڑتال کرنے والے لڑکوں کا رنگ لیڈر آپ کا پڑوسی ہے؟"

"ٹھیک ہے یہ بات، لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں نے اسے آپ کے خلاف اکسایا ہے۔"

"پروفیسر بلبیر سنگھ، میرے پاس جو خبر پہنچی ہے، اس میں آپ کے نام کا ذکر ہے۔"

"مجھے بھی پتا ہے، آپ کے ساتھ یہ بات کس نے کی ہے۔ چیمہ صاحب مجھ سے کینہ رکھتے ہیں، اس لیے ان کو ہمیشہ اس طرح کے موقعوں کی تلاش رہتی ہے۔ اس کے اپنے کردار کے بارے میں آپ بھی بخوبی جانتے ہو۔"

"وہ اچھا ہو یا برا، مجھے اس بات کے ساتھ کوئی سروکار نہیں، میرے پاس اور بھی ذرائع ہیں، اکیلا وہی نہیں۔"

"پھر بھی آپ نے میرے متعلق غلط اندازہ لگایا ہے۔ میں آپ کا خیرخواہ ہوں، اگرچہ میں آپ کی کئی باتوں کے تئیں حامی نہیں بھرتا۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ یہ ہڑتال آپ کے خلاف نہیں ہوئی، بلکہ سائنس کے ایک پروفیسر کے برتاؤ کے خلاف ہے۔"

"ایک ہی بات ہے، وہ پروفیسر ہمارے نزدیکی گاؤں کا ہے، اس کی بدنامی میری بدنامی ہے۔ آپ یہ بات کیوں نہیں سمجھتے، پروفیسر بلبیر؟"

''آخر میں وہی بات ہوئی، جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ دو ہفتوں میں ہی میرا تبادلہ ریت کے ٹیلوں والے علاقے میں ہوگیا۔ وہاں جانے سے پہلے خیال آیا کہ کیوں نہ یہ سرکاری نوکری چھوڑ دی جائے۔ دو تین پرائیویٹ کالجوں میں جانے کی کوشش کی تاکہ میرے سر پر لٹکتی تبادلے کی تلوار ہٹ جائے۔ لیکن سرکاری کالجوں سے پرائیویٹ کالج میں آنے والے کو شک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ چنڈی گڑھ میں بیٹھے وہ لوگ ایک سیکشن سے دوسرے سیکشن میں تبدیل ہونے پر اتنا واویلا مچا دیتے تھے، آپ نیچے کے دفتروں کو ٹرانسفر کے آرڈر بھیجتے وقت یہ نہیں سوچتے کہ اس کے ساتھ دوسروں پر کیا بیتے گی۔ تبادلے رکوانے کے لیے میں نے جب ہاتھ پاؤں مارے تو پتا لگا کہ بڑے افسر ماؤنٹ اولمپس پر بیٹھے ہوئے تھے اور اتنی بلندی سے آدم زاد انھیں کیڑے مکوڑوں جیسے لگ رہے تھے۔ ملک کی آزادی کے بعد کچھ افسر اپنے آپ کو لوگوں کے خادم سمجھنے لگے تھے۔ اصلی معنوں میں 'پبلک سرونٹس'، لیکن جلدی ہی کچھ ایسے افسر اعلیٰ مختلف عہدوں پر تشریف فرما ہوگئے جو اپنے آپ کو حاکم سمجھنے لگے۔ یہ بات شاید ہر محکوم قوم کے آزاد ہونے کے بعد، افسر شاہی میں پیدا ہو جاتی ہو۔

کچھ عرصہ ٹھوکریں کھانے کے بعد میں اس قابل ہوگیا کہ دنیاوی دانائی کی اہمیت کو سمجھ سکوں۔ اس طرح نئی جگہ پر کچھ سال آرام وچین سے گزر گئے۔ جلدی غصے میں آنے والی عادت مکمل طور پر ترک نہ ہوسکی، لیکن طریقے کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کا ڈھونگ کرنا مجھے آ گیا۔ زیادہ قصور میرا بھی نہیں تھا۔ اس پروفیشن کو اپناتے وقت میں نے جو منصوبے اپنے دل میں بنائے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ بکھرنے شروع ہوگئے تھے۔ اپنے ان آدرشوں کے ٹوٹنے کی بدولت ہی مجھے چڑ آتی تھی ورنہ سمجھ دار لوگ بیشک بڑے آرام کے ساتھ اپنے آدرشوں کو کھونٹیوں پر ٹانگ کر سرکاری کالجوں میں نوکریاں کر رہے تھے۔ کچھ عرصے کے لیے میں نے بھی ایسے لوگوں کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی —

''پروفیسر ظہیر سنگھ، آپ کالج میگزین کے مدیر اعلیٰ ہو؟''

''جی ہاں، گزشتہ پانچ سالوں سے۔''

''گزشتہ مہینے جب میں نے بطور پرنسپل اپنا چارج سنبھالا تو آپ میڈیکل لیو پر تھے۔''

''گردے کی تکلیف کی وجہ سے امرتسر کے سول اسپتال میں تین ہفتے داخل رہا تھا۔''

''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ بے شک ابھی کچھ دن اور گھر بیٹھ کر آرام کرلیں۔ آج کل تو داخلے چل رہے ہیں، سارے اسٹاف کی کالج میں ضرورت نہیں۔''

''تھینک یو، پرنسپل صاحب — میں اپنی چھٹی ایگزاسٹ کر چکا ہوں، ویسے بھی تھوڑا بہت چلنا پھرنا میرے لیے بہتر ہے۔''

''جیسے آپ کی مرضی، پروفیسر بلبیر، بات یوں ہے کہ میری لڑکی کو آپ نے کالج میگزین کا ایڈیٹر بنانا ہے۔ اس نے بی اے فائنل میں داخلہ لے لیا ہے اور انگریزی میں بہت اچھی ہے۔''

''ٹھیک ہے، سر — آئندہ مہینے میگزین کے سبھی شعبہ جات کے طالب علموں کا ایڈیٹر بننے کے لیے ٹیسٹ رکھیں گے، آپ کی بیٹی بھی اس میں بیٹھ جائے۔''

''ٹیسٹ آپ لیتے رہنا، اس کا ایڈیٹر بننا بہت ضروری ہے۔''

''سوری سر، یہ نامزدگی میں ہمیشہ ٹیسٹ کی بنیاد پر کرتا آیا ہوں — اب بھی اسی طرح ہوگا۔''

''چلو، ٹیسٹ آپ لے لینا، لیکن مارکنگ میں کسی دوسرے پروفیسر سے کروا لوں گا۔''

''اوکے سر، اس میں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

اسی طرح میں کچھ سالوں تک اس نئی جگہ پر اپنی عقلمندی کا ثبوت دیتا رہا۔ جب کبھی بہت جنگ ہوتی تو 'قہر درویش برجان درویش' والی کہاوت کو سچ ثابت کر دیتا۔ پھر ایک اور دوست آگئے۔ اتنے صاف گو، اتنے بے مروت، اتنے قانونی قسم کے کہ کالج میں کام کرنے کا مزہ ہی جاتا رہا۔ آہستہ آہستہ میں آرام دہ زندگی گزارنے کا عادی ہو چکا تھا۔ ازسرنو بااصول زندگی بسر اب مجھے مشکل کام دکھائی دے رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ پرنسپل مجھ سے کوئی کام نکلوالے اور مجھے بور نہ کریں، لیکن یہ نیا شخص تو چنان کی مانند تھا:

زمین جُنبد، نہ جُنبد گل محمد

کچھ عرصے بعد میں وہاں سے تبادلہ کروا کر کسی ریاستی کالج میں چلا گیا۔ یہاں پر آ کر کچھ وقت اچھا گزرا، کیونکہ اس پرنسپل نے جلدی ہی بھانپ لیا کہ بلبیر سنگھ منہ پھٹ ضرور ہے لیکن دل کا برا نہیں۔ غالباً دو سالوں کے بعد یہ پرنسپل ریٹائر ہو گیا۔

ان کے بعد جو نئے پرنسپل آئے وہ خود بھی پریشان رہتے اور دوسروں کو بھی پریشان کرنے میں پوری مہارت رکھتے تھے۔ میں نے انھیں بارہا گزارش کی کہ مجھ پر جانچنے پرکھنے والی نظر نہ رکھیں، میں فطرتاً ہی ایک ذمہ دار شخص ہوں لیکن انھیں میری بات پر یقین نہ آیا۔ ان کا خیال تھا کہ نظر وہ ضرور رکھیں گے، پڑھائیں یا نہ پڑھائیں۔ صبح پہلی گھنٹی بجتے ہی وہ اپنے دفتر سے باہر آ کر برآمدے میں کھڑے ہو جاتے۔ جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے میں اپنی کلاس میں چلا جاتا۔ وہاں جا کر کھڑکی کے شیشوں میں سے میں انھیں دیکھتا اور سوچتا کہ انھوں نے میرے اندر یہ گلٹ کمپلیکس تو پیدا کر دیا ہے کہ میں دو منٹ لیٹ ہوں لیکن باقی تینتالیس منٹ، کلاس میں کچھ کرواؤں یا نہ کرواؤں، اس بات کے متعلق انھیں کوئی فکر نہیں۔ کیوں نہیں، وہ یہ دو منٹ بھی میرے حوالے کر دیتے تاکہ میں اپنی کلاس کو آزادانہ طور پر پڑھاؤں، اپنا فرض بغیر کسی رکاوٹ کے پورا کروں۔ ڈیوٹی سمجھ کر اپنا کام کرنا اپنی جگہ پر تھا، لیکن اگر اس کو مشن سمجھ لیا جائے تو اس کا کوئی جواب نہیں۔

اسی بنا پر ان کے ساتھ بھی میری زیادہ دیر نبھ نہ سکی۔ لیکن وہاں سے بھی میں اپنی مرضی کے ساتھ چل پڑا۔ پھر ستلج پار کر کے سرکاری کالج لدھیانہ آ گیا۔ یہاں کا ماحول اچھا تھا، دل لگ گیا لیکن یہاں آنے کے دو سال بعد کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے جنھوں نے میری زندگی کا نقشہ ہی بدل دیا۔ ایک تو تھا 'بلیو اسٹار کا سانحہ' جس نے میرے وجود کو بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ مجھے اس طرح لگا جیسے طوفان نے کسی چیز کو اس طرح الٹ کر رکھ دیا ہو کہ اس کی آدھی جڑ باہر دکھائی دینے لگ گئی ہو۔ دوسرا واقعہ تھا وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کے افسوسناک قتل کے بعد دہلی اور ہندوستان کے دیگر شہروں میں سکھوں کا گھلوگھارا:

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

کچھ بھی سمجھ مجھے نہیں آ رہا تھا کہ میں کہاں تھا ــ اپنے ملک میں کسی پرائے ملک میں، کسی جنگل میں یا کسی گپھا میں؟

چڑیوں کے چہچہانے کی آواز سن کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ باہر صحن میں اچھی روشنی پھیل چکی تھی۔ میں نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھ نہ سکا۔ میرا سر بہت بھاری تھا۔ یہ رات بہت لمبی ہو گئی تھی، ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ میرے دل و دماغ کی عجیب حالت تھی۔ ایک طرف تو مجھے اٹھارہویں صدی کے واقعات یاد آ رہے تھے، دوسری طرف میری اپنی زندگی کی جھانکی میری آنکھوں کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ وقت کی گردش پچھلا چکر کاٹ کر اب ختم گئی معلوم ہوتی تھی۔ کہاں جائے گا یہ قافلہ؟ وقت کی رو سمندر کی لہروں کی مانند تھی۔ یہ آگے بھی جا سکتی تھی، پیچھے بھی ہٹ سکتی تھی۔ کئی مرتبہ تو پہلا وقت موجود وقت سے کہیں زیادہ مہذب دکھائی دینے لگتا تھا۔ اس دور کا انسان جنگل کے قانون کا تابع بنتا جا رہا تھا۔ ظاہری شکل میں اس کے چہرے پر تہذیب کا غازہ بے شک گہرا ہو چکا تھا لیکن اندر سے یہ وہی آدمی تھا جس کو اپنے ہم جنسوں کو قتل کرنے میں کوئی دریغ نہیں تھا۔

13

کرفیو کھل چکا تھا۔ جلدی جلدی تیار ہوکر، تایاجی کو الوداع کہہ کر میں گلی کے باہر آ گیا۔ میرے ہاتھ میں اٹیچی کیس تھا کیونکہ میں اس دن شام تک لدھیانہ واپس جانا چاہتا تھا۔ واپس جانے سے پہلے میں نے اپنے دو تین دوستوں کو ملنا تھا، ایک دو ضروری کام کرنے تھے۔ گلی کے باہر کوئی رکشا نہیں تھی۔ میں بیبے والے کنوئیں کی طرف پیدل ہی چل پڑا۔ وہاں سے ترکھانوں والی گلی نزدیک ہی تھی۔ اس گلی میں مجھے مہندر باوا کو ملنا تھا۔ ابھی میں برگد والی گلی سے تھوڑا آگے ہی گیا تھا کہ سامنے سے ملہوترہ صاحب آتے ہوئے دکھائی دیے۔

''کہاں چلے ہو سویرے سویرے؟''

''ویسے پوچھنے والی بات تو ہوتی ہے — کہاں سے آئے ہو، سویرے سویرے؟''

''تمھاری شرافت کا لحاظ کیا ہے۔''

''شکریہ — مہندر باوا کی طرف جانے کا ارادہ ہے۔''

''ان کی طرف بھی چلے جانا پہلے ناشتہ تو کرلو۔''

''نہیں، اس کی طرف ہی کروں گا، البتہ بیڈ ٹی تمھاری طرف پی سکتا ہوں۔''

''کمال ہے، بیڈ ٹی کے بغیر ہی گھر سے چلا آیا ہے؟ بتر صاحب نے تمھیں اس طرح کیسے آنے دیا؟''

''دراصل میں سیدھا اپنے گھر سے ہی آ گیا ہوں، ان کی طرف گیا ہی نہیں بس انھیں نیچے کھڑے کھڑے ہی الوداع کہہ دی۔''

''یہ تم نے ٹھیک نہیں کیا، بلبیر، وہ کیا سوچتے ہوں گے۔''

''اصل میں وہ بڑی زحمت اٹھاتے ہیں۔ اگر میں اوپر چلا جاتا تو انھوں نے مجھے ناشتہ کے بغیر نیچے نہیں آنے دینا تھا۔ میں پہلے ہی کئی دنوں سے ان کا مہمان بنا ہوا ہوں۔''

''پھر کیا ہوا، بلبیر، وہ بھی تو تمھارا اپنا گھر ہے۔ چلو اب ہمارے گھر کو اپنا گھر سمجھ کر اوپر آ جاؤ۔''

ایک طرح سے ملہوترہ صاحب مجھے بازو سے پکڑ کر اوپر لے گئے۔ اتنا خلوص کم ہی کسی اور میں نظر آتا تھا۔ ان کے ہاتھ میں پڑیوں والا لفافہ تھا اور دوسرے میں آلوؤں کی سبزی کا ڈونگا۔ اوپر پہنچ کر یہ دونوں چیزیں انھوں نے ٹیبل پر رکھ دیں اور اپنی بیوی کو ناشتہ لگانے کے لیے کہا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر انھیں روکنے کی کوشش کی۔

''ملہوترہ صاحب، میں تو صرف چائے کا ایک کپ ہی لوں گا اور کچھ نہیں۔''

''بات سنو، بلبیر، ناشتہ یہاں کر لیں، بیڈفی باوا صاحب کی طرف جا کر پی لینا۔''

''یعنی — شراب ڈالی تیخ پہ کباب شیشے میں۔''

کیا بات ہے اردو شاعری کی، بلبیر۔

''اس نے تو ہمیں تباہ کیا ہے
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے
ٹھیک ہے کہ نہیں؟''

''اچھا، یہ بتاؤ، پچھلی مرتبہ عید کے موقع پر میں نے تمھیں بلایا تھا تم کیوں نہیں آئے؟''

''میں نے اس وقت آ کر کیا کرنا تھا؟''

''بھئی عید کے موقع پر ہمارے گھر بہت رونق ہوتی ہے۔''

''کس طرح کی رونق ملہوترہ صاحب؟''

''حد ہو گئی — تمھیں نہیں پتا؟''

''ایک مرتبہ تم نے سرسری سی بات تو کی تھی۔ لیکن پوری بات کبھی نہیں بتائی۔''

''پوری بات اس طرح ہے کہ عیدالفطر ہم بڑی دھوم دھام سے مناتے ہیں اور بجنذارہ کرتے ہیں۔ ویسے یہ تو تمھیں پتا ہی ہے کہ ہمارے گھر ہر جمعرات کو پیروں فقیروں کے چراغ جلتے ہیں۔''

''وہ تو ہم بھی بھایاجی کے وقت سے جلاتے ہیں، لیکن اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔''

''بلبیر، ہم ان پیروں فقیروں کو حاضر ناظر جانتے ہیں۔ ہمیں یہ ہمیشہ اپنے آس پاس ہی معلوم ہوتے ہیں۔ ویسے تو میں عیدالاضحیٰ کو بھی یہاں ہونے کی کوشش کرتا ہوں لیکن عیدالفطر کے لیے تو میں خصوصی طور سے ممبئی سے امرتسر آتا ہوں۔''

''یہ سب کچھ مجھے عجیب سا لگتا ہے کہ ہندو کھتری ہو کر تم عید، وہ بھی اتنی عقیدت کے ساتھ مناتے ہو۔''

''ویسے تو بلبیر، ہمارے پتاجی کو بھی پیروں فقیروں میں بہت یقین تھا لیکن میرے سر پر تو ہمیشہ ان کا دستِ شفقت رہا ہے۔''

''معاف کرنا، ملہوترہ صاحب، مجھے اس وقت سردار جعفری کا ایک مصرع یاد آرہا ہے:

جہل سے پیدا ہوئے ہیں علم سے مر جائیں گے

ٹھیک ہے یہ بات؟''

''میرے حساب سے تو ٹھیک نہیں، تمھیں میں ایک واقعہ سناتا ہوں۔ بہت سال پہلے کی بات ہے، میرے پتاجی پٹھان کوٹ سے وصولی کے بعد یہاں پہنچے۔ اس وقت بس اسٹینڈ، ہال گیٹ سے باہر نیم پرنس ہال کے نزدیک ہوتا تھا۔ بس جب، بس اسٹینڈ میں آکر رکی تو ایک لڑکا ان کے پاس آکر پوچھنے لگا — 'آپ کا یہ اٹیچی میں اٹھالوں؟' اٹیچی کیس چونکہ ہلکا تھا اس لیے کسی سے اٹھوانے کی ضرورت نہیں تھی لیکن پتاجی اس لڑکے کو انکار نہ کرسکے۔''

''یہ کب کی بات ہے، ملہوترہ صاحب؟''

''بہت پرانی، ابھی پاکستان بنا نہیں تھا۔''

''اچھا۔''

''اٹیچی کیس لڑکے سے اٹھوا کر جب وہ اڈے سے باہر آئے تو زور سے آندھی چلنی شروع ہوگئی۔ آنکھیں گرد و غبار سے آلودہ ہوگئیں، دکھائی دینا بند ہوگیا۔ پتا جی ایک طرف کسی دکان کے برآمدے میں کھڑے ہوگئے۔ ان کو اس بات کا بھی خیال نہ رہا کہ انھوں نے اپنا اٹیچی کیس کسی کو تھمایا ہوا ہے۔''

''ملہوترہ صاحب، پہلے اس طرح کی آندھیاں بہت آیا کرتی تھیں، اب وہ بات نہیں رہی۔''

''ہاں — آندھی جب رکی تو پتا جی سڑک پر آگئے۔ ادھر ادھر دیکھا، وہ لڑکا جس کو انھوں نے اٹیچی کیس سونپا تھا انھیں کہیں نظر نہ آیا۔ وصولی کے سارے روپے تو اس اٹیچی کیس میں تھے۔ مایوس ہوکر وہ اپنے گھر کی طرف چل دیے۔''

''بڑی عجیب سی صورت حال ہوتی ہے، اس وقت دل کی۔''

''ہاں، بلبیر — وہ ابھی دو چار قدم ہی چلے ہوں گے کہ فقیرانہ لباس میں ایک سفید ریش بزرگ ان کے پاس آئے اور پوچھنے لگے — 'یہ سامان آپ کا ہی ہے؟' پتا جی نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو ان بزرگ کے پاس وہ لڑکا بھی ہاتھ میں اٹیچی کیس پکڑے ہوئے کھڑا تھا۔''

''میں اٹیچی کیس پکڑے ہوئے۔''

''بڑی حیرانی کی بات ہے؟''

''آگے سنو — پتا جی کے منھ سے ابھی 'ہاں' کا لفظ نکلا ہی تھا کہ وہ بزرگ غائب ہوگئے۔ پتا جی نے ادھر ادھر دیکھا لیکن وہ کہیں نظر نہ آئے۔ بڑے حیران ہوئے۔ آخر وہی لڑکا ان کا اٹیچی کیس گھر چھوڑ کر گیا۔''

''ان بزرگوں کے اس طرح اچانک گم ہوجانے کے بارے میں ہی تو مرزا غالب نے کہا ہے:

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی
اسی لیے میں ان بزرگوں سے ذرا گریز ہی کرتا ہوں۔''
''ظہیر، تمھیں شاید ہماری یہ بات اوہام پرستی لگتی ہو لیکن یہ حقیقت ہے۔ ویسے تو میں بھی معجزوں میں یقین نہیں رکھتا۔ اور بھی کئی واقعات اس طرح کے ہیں، پھر کبھی سناؤں گا۔ اب تمھیں جلدی ہے۔''
اتنے میں ناشتہ لگ گیا۔ میں نے پہلے چائے کے دو گھونٹ بھرے۔ پھر پوریاں کھانے لگا۔ ویسے تو امرتسر کی پوریوں کے ساتھ لسی ہوا کرتی تھی لیکن وقت کے بدلنے کے ساتھ لسی کی جگہ اب چائے نے لے لی تھی۔ یہ تو عام سی بات تھی۔ ویسے سماجی یا سیاسی سطح پر جب کوئی تبدیلی آتی ہے تو پہلے پہل آدمی کو الجھن ہوتی ہے لیکن تھوڑا عرصہ گزرنے پر صورت حال معمول کے مطابق ہو جاتی ہے۔ وقت شاید اسی طرح ہی چکر کاٹتا رہتا ہے۔
''ملہوترہ صاحب، ہمارے آپسی تعلقات میں یہ جو گرہیں پڑ گئی ہیں یہ کب کھلیں گی؟''
''وقت کوئی کروٹ بدلے گا تو حالات سدھر جائیں گے۔ یہ چیزیں دیرپا نہیں ہوتیں۔''
''یہ سب طفل تسلیاں ہیں اور کچھ نہیں۔''
''میں تو بس چاہتا ہوں، ظہیر، کہ ہم ایک دوسرے کے تہوار مشترکہ طور پر منائیں۔'' بالکل ویسے ہی جیسے میر تقی میر نے کہا تھا:

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے ہو کیا ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

لیکن یہ بات نہ بھولنا، ملہوترہ صاحب کہ یہ بات کسی نے نہیں ہونے دینی۔ وہ زمانہ اور تھا۔ میر کا کسی نے کچھ نہیں بگاڑا تھا لیکن آج کے زمانے میں اس پر مقدمہ چل سکتا تھا، اسے سنگسار کیا جا سکتا تھا، اس کی کتاب ضبط ہو سکتی تھی یا پھر اسے روپوش ہونے پر مجبور کیا

جا سکتا تھا۔"

"تم اتنے مایوس مت ہوں، بلبیر ہم ترقی پسند ہیں، پرامید ہیں۔ اچھے مستقبل میں یقین رکھنا بہت ضروری ہے۔"

"مجھے یہ بتاؤ، ایک طرف تم بچھڑی روحوں کو حاضر ناظر سمجھتے ہو، دوسری طرف جیتے جاگتے انسانوں کو، اپنے ہم وطنوں کو دھتکارتے ہو۔"

"بلبیر، مجھے تمھاری بات سمجھ نہیں آ رہی۔"

"پرسوں تمھارے بندوں نے کیا کیا تھا؟ ایک دودھی کو مار دیا، صرف اس لیے کہ اس کے سر پر بال تھے اور بالوں پر پگڑی۔"

"لیکن یہ بھی تو سوچو کہ وہ لوگ بھی ہیں جو چپ چاپ آتے ہیں، دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں اور جو سامنے آئے اسے گولیاں مار کر دوڑ جاتے ہیں۔"

"بس یہی بات اچھی نہیں ملہوترہ صاحب۔ ہم بات کی تہہ تک نہیں پہنچتے، بس تقابلی مطالعہ شروع کر دیتے ہیں۔ غلط بات کو غلط ہی کیوں نہ کہتے؟" اس کو الٹ طریقے کے ساتھ ہی ٹھیک کیوں ثابت کرنا چاہتے ہو؟"

میں تمھارے ساتھ اتفاق کرتا ہوں بلبیر۔ مجھ سے زیادہ اور کون تمھارے ساتھ اتفاق کر سکتا ہے۔ اچھا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں:

ہم سے پوچھو بہارِ جلوۂ دوست
ہم نے فرقت کے دن گزارے ہیں

اس طرح کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ پھر میں وہاں سے اٹھ کر بیے والے کنوئیں کے چوک میں پہنچ گیا۔ چوک سے بائیں ہاتھ والا موڑ مڑ کر میں دائیں ہاتھ والی پہلی گلی میں چلا گیا۔ ابھی تک اس گلی کا نام ترکھانوں والی گلی ہی تھا، اگرچہ اب اس میں کوئی بھی گھر ترکھانوں کا نہیں تھا۔ یہ بات ویسی ہی تھی جیسے ہماری گلی کا نام سناروں کی گلی تھا، بے شک اس میں اب کوئی بھی گھر سناروں کا نہیں تھا۔ مہندر باوا کے گھر کے دروازے کی میں نے کنڈی کھٹکھٹائی۔ وہ اس وقت گھر ہی تھا۔ ٹیڑھی میڑھی اندھیری سیڑھیاں چڑھتا

ہوا میں دوسری منزل پر پہنچ گیا۔ اس وقت وہ کسی کتاب کی اکھڑی ہوئی جلد کو ٹھیک کر رہا تھا۔ نوکری بینک کی، خدمت اردو ادب کی۔ اس نے اردو میں رسالہ نکالنے کا شوق بھی پچھلے دنوں میں پورا کرلیا تھا، اب وہ ریٹائر ہوکر، پہلے سے بھی زیادہ زندگی کے جھمیلوں میں پھنستا جا رہا تھا۔

''کیا کر رہے ہو، باوا صاحب؟''

''لیلیٰ کے خطوط' اور 'مجنوں کی ڈائری' کی جلدیں اکھڑ گئی تھیں، ان کو ٹھیک کر رہا ہوں۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کا ادبی شوق ابھی تک قائم ہے۔''

''سچ پوچھیں، بلبیر، مجھے اب کسی چیز کا کوئی شوق نہیں، بس گزر رہی ہے زندگی — بے مطلب۔''

''کوئی زمانہ تھا جب ہم سمجھتے تھے کہ ادب ہی زندگی ہے۔''

''اب تو غم روزگار دیگر غموں پر حاوی ہوگئے ہیں، بلبیر۔''

''سچی بات تو یہ ہے باوا صاحب، اس وقت محبوب کی بے رخی سے تنگ آکر میں نے ادب کا سہارا لیا۔ پھر جب محبوب ہماری طرف مائل ہونے لگا تو ہم — چھوڑ دے چھوڑ دے میرا بازو — میں یقین رکھنے لگ پڑے۔ اب حالت یہ ہے کہ:

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم

آگے پتا نہیں کون سا گل کھلے۔''

''بات سنو بلبیر — کیوں زخموں پر نمک چھڑکتا ہے؟ تمھیں پتا ہے ملکی تقسیم نے سینے چور چور کردیے تھے۔ جو گھروندہ ہم 1944 سے بناتے چلے آرہے تھے، وہ 1947 میں ٹوٹ گیا۔''

''یہ باتیں اب بہت پرانی ہوگئی ہیں، باوا صاحب وقت بہت آگے نکل چکا ہے۔ ہم ہی باوا صاحب وقت کے ساتھ ساتھ بدل نہیں سکے۔''

''ٹھیک ہے تمھاری بات، لیکن جو نقص یا نیز حاپن اس وقت ہماری نسل کی طرز

زندگی میں پڑ گیا تھا وہ دوبارہ سیدھا نہیں ہو سکا۔''

''اس وقت محنت کشوں کو مناسب جگہ دینے کے بارے میں ہم سوچا کرتے تھے، وہ بات تو اب مضحکہ خیز ظاہر ہونے لگی ہے۔ یا تو ہم اس وقت غلط تھے یا اب غلط ہیں — کیا پتا؟''

''بات سنو، بلبیر، تمھیں یاد ہوگا ہمارے گھر کے سامنے یعقوب رہا کرتا تھا — گورا چٹا، ہنس مکھ اور جوشیلا۔ وہ کیسے مجاز لکھنوی کا یہ گیت جھوم جھوم کر گایا کرتا تھا:

بول اری او دھرتی بول
راج سنگھاسن ڈانواڈول

لیکن اپنا گھر چھوڑتے ہوئے اس نے مجھے کہا — باوا صاحب، یہ جو کچھ ہوا ہے یا ہو رہا ہے، اس میں تمھارا انفرادی طور پر چاہے کوئی قصور نہیں لیکن اجتماعی طور پر تم بھی اتنے ہی مجرم ہو جتنا کوئی اور۔''

''مہندر باوا، ان باتوں کی تاریخی نقطۂ نظر سے تو بڑی اہمیت ہے لیکن آج کی صورت حال سے تو اس کا کوئی تعلق نہیں۔''

''کیوں نہیں؟ ہے، بلکہ بہت زیادہ۔ جس قسم کے سیاست دان اس وقت ہمارے اوپر قابض ہیں، اس وقت بھی ان کا رنگ روپ اسی طرح کا تھا، چاہے جسمانی چولا کوئی اور ہو۔''

''ملک کی تقسیم ہمارے اوپر غیر ملکی حکومت کی طرف سے ٹھونسی گئی تھی اس میں ہمارے سیاستدانوں کا کیا قصور؟''

''دیکھو بلبیر سنگھ، تقسیم کو ہمارے سیاستدانوں نے ہی تسلیم کرلیا، اگر نہ مانتے تو اب بات کچھ اور ہی ہوتی تھی۔''

''مانتے کیوں نا، جب لوگوں نے فسادات کے ذریعے اودھم مچا رکھا تھا، قتل و غارت ہو رہی تھی، خون خرابہ ہو رہا تھا، آتش زنی ہو رہی تھی۔''

''تمھیں یاد ہوگا، بلبیر، کہ یہ کام شروع میں ہمارے سیاستدانوں نے ہی کروایا تھا۔

شیر جب پنجرے سے باہر آ گیا تو اس سے ڈرتے ہوئے وہ سب اپنے گھروں میں جا چھپے اور بعد میں کہہ دیا تھا کہ یہ تقسیم ہم پر ٹھونسی گئی ہے۔''

''اب باوا صاحب، یہ جو دمن چکر چل رہا ہے یہ کہاں جا کر رکے گا۔''

''بات تو طاقت کے غلط استعمال کی ہے۔ طاقت کا نشہ کچھ بندوں کو درندے بنا دیتا ہے۔ درندے تو پھر بھی کسی مقصد کے لیے انسان کو مارتے ہیں لیکن متکبر انسان صرف مارنے کی خاطر مارتے ہیں۔ باقی جلبیر سنگھ، کس کس کو گناہ گار ٹھہرایا جائے جبکہ سارا آوا ہی اُوت چکا ہے۔''

اتنی بات کہہ کر مہندر باوا کسی گہری فکر میں ڈوب گیا۔ اس کے ماتھے کی شکنیں اور گہری ہو گئیں۔ اس کے پاس ہر بات کا جواب تھا لیکن اس سلسلے میں اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ سنہرے مستقبل کے خواب دیکھنے والے ہم لوگ ایسی دلدل میں پھنس چکے تھے کہ باہر نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ جتنے زیادہ ہم ہاتھ پاؤں مارتے تھے، اتنے ہی نیچے دھنستے جا رہے تھے۔

دوپہر کا ایک بج چکا تھا۔ وہاں سے جانے کے لیے مجھے جلدی تھی لیکن باوا صاحب لنچ کے لیے زور دے رہے تھے۔ مجھے وہ 'لیلیٰ کے خطوط' اور 'مجنوں کی ڈائری' کی ورق گردانی کرنے کے لیے کہہ کر آپ غسل کرنے کی خاطر چلے گئے۔ کسی زمانے میں ہم نے یہ دونوں کتابیں بڑے شوق کے ساتھ پڑھی تھیں۔ جو باتیں تیں پینتیس سال پہلے انوکھی لگتی تھی، اب عام ہو گئی تھیں۔ ان کتابوں کی ورق گردانی کرتے کرتے میرا دھیان گزرے ہوئے وقت کی طرف چلا گیا۔ ان دنوں کی طرف جب ہم خود لیلیٰ کے خطوط کے انتظار میں مجنوں بنے ہوئے تھے —

''مہندر باوا، اب تو موسم بدل گیا ہے۔ دوپہر کے وقت کوٹھے پر چڑھ کر پڑھائی کرنے میں کوئی تک نظر نہیں آتی۔''

''موسم چاہے بدل گیا ہے، جلبیر لیکن شربت دیدار کے لیے میرے دل میں حسرت اور بڑھ گئی ہے۔''

''شربتِ دیدار؟ کیا مطلب؟ کھل کر بتاؤ، یار کیا بات ہے؟''

''یہاں آجاؤ، میرے پاس — اس منڈیر کے پردے میں۔ اس کی ماں کو پتا نہیں لگنا چاہیے۔''

''کس کی ماں کو؟ کوٹھے پر اتنی دھوپ میں کون آئے گا۔''

''کوئی اور آئے نہ آئے لیکن وہ ضرور آئے گی — میری سُمن۔''

انھی دنوں ہمارے ایف اے کے سالانہ امتحان ہو رہے تھے۔ اپریل کا مہینہ تھا، گرمی بڑھ رہی تھی۔ سردیوں میں تو ہم کالج سے آکر کوٹھے پر دھوپ میں بیٹھ کر کچھ دیر پڑھ لیتے تھے لیکن سالانہ امتحان شروع ہونے کے بعد ہم اپنے اپنے گھروں میں پڑھنے لگ گئے تھے۔ شام کو ہم سیر کے لیے کمپنی باغ ضرور جاتے تھے۔ پہلے تو مہندر باوا ہی مجھے بلانے کے لیے آیا کرتا تھا لیکن اب کچھ عرصے سے وہ اس کام میں ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ اس کا کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد میں جب اس کے گھر جاتا تو وہ مجھے اپنے کوٹھے پر ہی ملتا۔ زیادہ تر وہ اپنے ہاتھوں میں کتاب پکڑے مٹی کے سائے میں کھڑا ملتا۔ پہلے تو وہ مجھے ٹالتا رہا لیکن ایک دن اس نے اپنے دل کا راز کھول دیا۔ سمن بالا پچھلی گلی میں، ان کے گھر سے تین چار گھروں کے فاصلے پر رہتی تھی۔ لمبا قد، گٹھے ہوئے جسم والی یہ لڑکی گزشتہ مارچ میں دسویں کا امتحان دے چکی تھی۔ یہ دن اس کے فرصت بھرے تھے لیکن ہمارے امتحان ابھی ہونے تھے اور پڑھنے کے سوا ہمیں اور کوئی کام نہیں تھا۔

''شغل شغل میں ہی مہندر باوا نے اس لڑکی میں دلچسپی لینی شروع کردی تھی۔ دوسروں کی نظروں سے بچنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ کڑکتی دوپہر میں کوٹھے پر چڑھ کر ایک دوسرے کو دیکھا جائے۔ اسی بنا پر اب مہندر باوا کا بہت زیادہ وقت اپنے گھر کی چھت پر ہی گزرنا شروع ہوگیا تھا۔ مٹی کے پردے میں کھڑا کھڑا جب وہ تھک جاتا تو وہ اس کی دیوار کے ساتھ چارپائی کھڑی کرکے چتکبری دھوپ چھاؤں میں کرسی پر بیٹھ جاتا اور پکڑی ہوئی کتاب کے ورق پلٹنے لگتا۔ سمن بالا کا کسی بھی وقت اپنے گھر کی چھت پر آجانا کسی معجزے کے واقع ہونے والی بات تھی۔ سارے دن میں دو تین دفعہ بھی اگر اس طرح

ہو جاتا تو مہندر باوا اس دن کو اپنی کامیابی تصور کرتا۔ عام طور پر اسے لیلیٰ کی بجائے لیلیٰ کی ماں کے ہی دیدار ہوتے۔ اسی لیے وہ ممٹی یا چار پائی کے پردے میں بیٹھنا یا کھڑے ہونا مناسب سمجھتا تھا۔ فرصت ملنے پر سمن بالا اپنے کوٹھے پر آتی، برساتی کا دروازہ کھولتی اور کھڑکی میں سے مہندر باوا کی طرف دیکھنے لگتی۔ اتنے میں مہندر باوا کے ہاتھوں سے کتاب نیچے گر پڑتی اور اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل جاتیں۔ دو تین مرتبہ میں بھی اسے اس حالت میں دیکھ چکا تھا۔ اس وقت وہ مجھے سیڑھیوں میں جا کر ایک چھوٹے سے طاق میں سے اس لڑکی کو دیکھنے کی ہدایت کرتا۔

سمن بالا کے تئیں مہندر باوا کی یہ دلچسپی دیکھ کر مجھے بہت حیرانی ہوئی۔ اس لڑکی کو تو ہم بچپن سے جانتے تھے۔ اس کا بڑا بھائی چمن لال اسکول میں پڑھتے وقت میرے چھوٹے چچا کا کلاس فیلو تھا۔ ان دنوں میں بھی کبھی کبھی اپنے چچا کے ساتھ ان کے گھر چلا جاتا تھا۔ اس کا گھر مہندر باوا کے پڑوس میں ہونے کی وجہ سے وہ کئی مرتبہ پتنگ اڑاتا ہوا ان کے کوچے کے گھروں تک چلا جاتا تھا۔ دسویں میں فیل ہو کر چمن لال اپنے پتا کے ساتھ دکان پر جا بیٹھا تھا۔ جلدی ہی بعد میں میرے چھوٹے چچا فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ یہ باتیں تین چار سال پرانی تھیں، لیکن لگتی بہت ہی پرانی تھیں۔

''باوا، اس وقت یہ تو بڑی عام سی لڑکی ہوتی تھی، سانولی، سلونی اور نازک اندام۔''

''ہوتی ہوگی بلبیر — لیکن اب بتاؤ موٹی تازی ہے کہ نہیں؟''

''باوا تمھیں تو ہم اپنی ٹولی میں سب سے زیادہ سمجھ دار انسان سمجھتے تھے، تم بھی عاشق مزاج نکلے۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا، بلبیر کہ تم سے کوئی دو سال بڑا ہونے کی وجہ سے ہی تم مجھے بزرگ سمجھنے لگے تھے۔ ابتدائی سال گاؤں میں رہنے کی وجہ سے میں نے اپنی پڑھائی دیر سے شروع کی تھی اور پھر شہر میں آکر تمھارے ساتھ آملا۔ ویسے میں نے اب بی اے کا امتحان دینا تھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں؟''

خیال تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ اس کے دل کی حالت نارمل ہو جائے گی لیکن یہ

مرض دن بدن بڑھتا ہی گیا۔ امتحان کے بعد مجھے اپنے ساتھ لے کر سمن بالا کی گلی کے چکر کاٹنے لگا۔ اس کے گھر کھڑکیوں کی طرف دیکھتے ہوئے ہم پہلے آگے نکل جاتے، پھر واپس لوٹ آتے۔ دن میں یہ عمل تین چار مرتبہ ہوتا اور ایک دو مرتبہ ہم سمن بالا کو دیکھ ہی لیتے۔ جب وہ مسکراتی تو میں اپنی نظریں جھکا لیتا لیکن باوا کی گردن اور اوپر اٹھ جاتی۔ کبھی کبھی ہم مشکل میں بھی پھنس جاتے۔ ہمیں بار بار ادھر ادھر گھومتے ہوئے دیکھ کر کوئی نہ کوئی عورت ہمارے پیچھے پڑ جاتی اور گھورنے لگتی یا پھر ان کی گلی کا کوئی فرد ہماری گستاخ نظروں کو بھانپتا ہوا زور سے کھانستا۔ ایسے حالات میں ہم وہاں سے کھسکنا ہی پسند کرتے۔ دو چار مرتبہ وہ ہمیں اپنے چبوترے پر کھڑی مل گئی۔ میں نے باوا کو اس کے ساتھ کوئی بات کرنے کے لیے کہا لیکن وہ خالص ڈرپوک ثابت ہوا۔

پھر ہمارے امتحانوں کے نتیجے نکل آئے۔ ہم دونوں اپنے کالج کی بی اے کلاس میں داخل ہو گئے اور سمن بالا ماڈرن کالج میں پڑھنے لگی۔ ہمارا کالج شہر کے اندر تھا لیکن اس کا کالج شہر سے باہر مال روڈ پر تھا۔ ہم اپنے کالج میں پہلے دو تین پیریڈ لگاتے پھر سائیکلوں پر ماڈرن کالج پہنچ جاتے۔ کالج کے گیٹ سے تھوڑا پہلے درختوں کے جھنڈ کے نیچے ہم اس کے انتظار میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کھڑے رہتے۔ جب وہ باہر آتی تو اس کے ساتھ دو تین لڑکیاں اور ہوتیں۔ وہ سبھی لڑکیاں ایک رئیسی تانگے میں بیٹھ جاتیں اور ہم سائیکلوں پر ان کے پیچھے لگ جاتے۔ رئیسی تانگے والی لڑکی ہمارے بازار کے سیٹھ موہن لعل کی لڑکی تھی۔ شروع شروع میں وہ مجھے اس طرح تانگے کے پیچھے آتا ہوا دیکھ کر حیران ہوئی بعد میں شاید سمن بالا نے اس کو ساری بات سمجھا دی تھی۔ جلد ہی اس کی آنکھوں سے حیرانی کے اثرات غائب ہو گئے۔

''باوا، یہ بھی کوئی عشق ہے؟ نہ بات نہ چیت اور نہ کوئی چٹھی پتر۔''

کسی شاعر نے کہا ہے:

دیکھ لیتے ہیں آہ کرتے ہیں
یہ بھی کوئی گناہ کرتے ہیں

''تمھارا کیا خیال ہے، بلبیر؟''

''یہی تو میں کہتا ہوں، باوا کہ کوئی گناہ تو کرو۔''

''تمھارا مطلب ہے، جوتیاں کھاؤں۔''

''نہیں کھانی تو پھر اس کا تصور چھوڑ دو۔''

''تم بھی بلبیر، اب میرے دوست کم اور ناصح زیادہ بن گئے ہو۔ اپنا وقت بھول گئے ہو، جب تم سلمٰی کے گھر جانے کے لیے اتنا بے قرار ہوتے تھے۔''

''بے شک، میں سلمٰی کو پیار کرتا تھا لیکن اسے میرے ساتھ جیسے چڑ تھی، اس لیے وہ ہمیشہ میرے ساتھ بحث کرتی رہتی تھی۔ لڑتی جھگڑتی وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی — اگر یہاں سے نہ جاتی تو شاید اس کے دل میں میرے لیے پیار پنپ پڑتا۔''

''میرا تو خیال ہے، بلبیر، کہ اگر پاکستان نہ بنتا تو تم نے اس کے گھر کے سامنے جھونپڑی بنا لینی تھی۔ میری بات ٹھیک ہے نا؟''

''تمھارا بھی تو یہی حال ہے — گھر ہم نے لیا ہے، تمھارے گھر کے سامنے۔ اب تمھارا اگلا پروگرام کیا ہے؟''

''اگلے پروگرام کا کس کو پتا ہے، بلبیر۔''

''آہستہ آہستہ ان دونوں میں خط و کتابت کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ یہ بات پایہ تکمیل تک اس لیے پہنچی کہ یہ دونوں شام کو ایک ہی کوچنگ سینٹر میں جانے لگے۔ باوا کو کوچنگ کی ضرورت اس لیے تھی کہ وہ اپنے کالج میں جانے کی بجائے سمن کے کالج کے چکر زیادہ کاٹتا تھا۔ سمن کو کوچنگ کی ضرورت اس لیے تھی کہ وہ اپنی کتابیں پڑھنے کی بجائے ہندی کے مروج ناول زیادہ پڑھنے شروع کر دیے تھے۔ اس طرح پہلے ان میں خط و کتابت کا سلسلہ ہوا پھر ملاقاتوں کے لیے بھی انھوں نے وقت نکال لیا۔ ایف اے اور بی اے کی کلاسوں میں پندرہ منٹوں کا وقفہ تھا۔ اس وقفے میں وہ ایک دوسرے سے بات کر لیتے تھے۔ میں اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق صلاح کار کا اپنا رول ادا کرتا رہا۔ اس طرح جیسے باتوں باتوں میں ہی دو سال بیت گئے۔ باوا نے بی اے پاس کر لی اور سمن نے ایف

اے۔ وہ آگے پڑھنا چاہتی تھی مگر گھر والوں کو اس کی شادی کی فکر لاحق ہوگئی۔ اس طرح وہ دوبارہ کالج میں داخل نہ ہوسکی۔ ادھر باوا کو اپنے ایک رشتے دار کے حسن سلوک کی وجہ سے بینک میں نوکری مل گئی۔ سمن کی شادی کی جب بات چلی تو باوا چوکنا ہوگیا لیکن اسے کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ پھر جیسے اتفاق سے بات کو آگے بڑھانے کا موقع حاصل ہوگیا۔ میرے چھوٹے چچا اپنی سالانہ چھٹی پر آگئے۔ ان سے باوا نے اپنے دل کی بات کی۔ جلدی ہی ہرجندر سنگھ اور چمن لال میں ملاقات ہوگئی۔ ہمیں کسی مشکل کا خواب و خیال بھی نہیں تھا لیکن —

''میں نے چمن لال کے ساتھ بات کی تھی''، ہرجندر سنگھ نے کچھ دنوں بعد ہمیں بتایا۔

''پھر —؟'' میرے منھ سے اچانک نکلا۔

''وہ کہتا ہے کہ ہم سمن کی شادی کسی مونے لڑکے کے ساتھ کرنی ہے۔''

''کیا مطلب —؟'' باوا خاموش نہ رہ سکا۔

''مطلب یہ بیٹا''، ہرجندر سنگھ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، ''کہ تمھیں میرے والا حلیہ اختیار کرنا پڑے گا۔''

''یعنی —؟'' میں نے سوالیہ نظروں کے ساتھ اپنے چچا کی طرف دیکھا۔

''یہی کہ مہندر مونا ہوجائے''، ہرجندر سنگھ نے بات واضح کردی۔

''یہ نہیں ہوسکتا''، مہندر باوا تلملایا، ''میں کسی بندش میں یہ کام نہیں کرسکتا۔''

''دیکھو، مہندر باوا''، ہرجندر سنگھ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی، ''تمھارے پتاجی گورسکھ ہیں، لیکن تمھارے بڑے اور چھوٹا بھائی مونا نہیں، اس طرح اگر تو بھی مونا ہوجائے گا تو کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔''

''شاید نہ ہو''، مہندر باوا نے گہری سوچ میں ڈوبتے ہوئے کہا، ''لیکن میں کسی بندش کے تحت مونا نہیں ہوں گا۔''

''اور چچاجی''، میں نے اپنے دل کی بات کہی، ''یہ دونوں گھرانے کھتری ہیں، پھر

مونے یا سکھ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''یہی بات میں نے اسے کہی تھی — لیکن اس نے ایک ہی رٹ پکڑ لی کہ یہ شرط ضرور پوری ہونی چاہیے''، ہرجندر سنگھ کو بھی چمن لال کے سلوک پر افسوس تھا۔

''یہ شرط دھونس کی طرح ہے۔'' مہندر باوا کے لہجے میں خودداری کی جھلک تھی''، اس طرح میں کسی کے ماتحت نہیں ہوسکتا۔ میں غیرت اور پوری خودداری کے ساتھ جینا چاہتا ہوں۔''

''پھر یہ بات یہیں پر رہنے دو''، ہرجندر سنگھ بات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ اس طرح وہ بات وہیں پر ہی رک گئی۔ کسی نے حیل حجت نہ کی۔ گھر والوں کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ پھر بھی مہندر باوا نے سمن کو لکھے اپنے آخری خط کے آخر میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ساحر لدھیانوی کا ایک شعر لکھ دیا تھا:

تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کردو
ورنہ ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کرلو

''کیا بات ہے، ہلبیر؟'' مہندر باوا نے کمرے میں آتے ہوئے کہا، ''نیند آرہی ہے؟''

''نہیں، ویسے ہی آنکھیں بند کر کے میں بیتے ہوئے دنوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں سمجھا کہ تم 'لیلیٰ کے خطوط' اور 'مجنوں کی ڈائری' پڑھ رہے ہوں گے۔'' باوا نے وہ دو کتابیں ٹیبل پر سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

14

مہندر باوا کے گھر کھانا کھانے کے بعد میں نے بس اسٹینڈ کے لیے رکشا پکڑ لی۔ میں شام تک لدھیانہ پہنچ جانا چاہتا تھا۔ رکشا میں بیٹھے بیٹھے مجھے خیال آیا کہ کیوں نا آدھے پونے گھنٹے کے لیے پروفیسر والیہ کو مل لیا جائے۔ ان کا گھر بس اسٹینڈ کے نزدیک ہی تھا۔ رکشا جب رام باغ کے نزدیک پہنچی تو میں نے رکشا والے کو بھائیاں دے شوالے کی جانب جانے کے لیے کہا۔ شوالے کے نزدیک کرشنا اسکوائر میں ہی ان کا گھر تھا، اتفاق سے پروفیسر والیہ اس وقت گھر ہی تھے اور اس طرح اچانک میرے گھر آنے پر وہ بہت خوش ہوئے۔ ان کی بیوی بھی میرا بڑا احترام کرتی تھی اور دونوں بچے بہت ملنسار تھے۔ عمر میں پروفیسر والیہ مجھ سے کافی چھوٹے تھے لیکن ایک پروفیشن میں ہونے کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کے کافی نزدیک آگئے تھے۔ وہ مقامی خالصہ کالج میں انگریزی کے استاد تھے۔ ملتے ہی ہماری باتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پہلے کالج کی باتیں، پھر یونیورسٹی کی باتیں، پھر باتوں میں باتیں۔

''لدھیانہ میں جنگجو تنظیموں کا کیا رول ہے؟''

''رول تو ہر جگہ پر ایک سا ہی ہے، پروفیسر والیہ۔''

''یہ بات اب کہاں جا کر ختم ہوگی؟''

''ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا، کچھ اور وقت لگے گا۔''

''پروفیسر بلبیر، یہ دکھ درد تو ہماری نسل کی تقدیر بن گئے۔''

''لیکن یہ بات بھی اچھی طرح واضح نہیں کہ سرکار کی طرف سے پنجاب کے لوگوں کو دبایا جا رہا ہے یا پنجابی آپ ہی ایک دوسرے کو اذیتیں دینے پر آمادہ ہیں؟''

''پنجاب کے ساتھ شروع ہی سے ناانصافی ہوتی آرہی ہے، پروفیسر بلبیر۔ جان کو جوکھم میں ڈالنے کے لیے یہ اور دیگر سہولیات حاصل کرنے کے لیے دوسرے۔ اگر سکھ اپنا حق مانگیں تو فرقہ پرست کہلائیں اور اگر اپنے صوبے کے لیے کوئی مانگ پیش کریں تو ملک کے اتحاد و سالمیت کے لیے خطرہ بن جائیں۔''

''مجھے تو، پروفیسر والیہ، جنگجوؤں کی طرف سے شروع کیا گیا یہ سنگھرش فرانسیسی انقلاب کی یاد دلاتا ہے، جو آہستہ آہستہ اندرونی مخالفت کا شکار ہو گیا تھا۔''

''کیا مطلب—؟''

''مطلب یہ کہ شروع شروع میں مقاصد اونچے، لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ گاڑی پٹری سے نیچے اترتی چلی جائے۔''

''آپ کی بات میں سمجھ گیا، پروفیسر بلبیر۔ کچھ لوگ سچے دل سے تبدیلی چاہتے ہیں اور تحریک کی رہنمائی بھی کرتے ہیں لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ سنگھرش کی کمان ان کے ہاتھوں سے نکل جاتی ہے۔ پھر جرائم پیشہ لوگ ان کی صفوں میں آشامل ہوتے ہیں اور ایسا خلل ڈالتے ہیں کہ ٹھیک اور غلط والا بھید غائب ہو جاتا ہے۔ ایک طرف سے آواز آتی ہے لڑو دوسری طرف سے آواز آتی ہے، دوڑو۔''

ہماری یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ باہر شور مچ گیا۔ ہم چائے کے اپنے پیالے ٹیبل پر رکھ کر باہر آ گئے۔ لوگ گھبرا کر اپنے گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ کچھ دیر پہلے دھماکے کی آواز ہم نے بھی سنی تھی لیکن اس کی طرف توجہ کسی نے نہیں دی۔ ہمارے باہر آنے پر ایک بار پھر زوردار دھماکہ ہوا۔ یہ آواز سن کر لوگ دوڑتے ہوئے اپنے گھروں میں جا داخل ہوئے۔ جلدی ہی پتا لگ گیا کہ بھائیاں دے شوالے کے باہر جہاں پھولوں والا بیٹھتا تھا، وہ بم چلے ہیں۔ سائیکل والا کوئی آدمی اپنی سائیکل بجلی کے کھمبے سے کھڑی کر کے تھوڑے فاصلے پر ہوٹل پر سے چائے پیتا رہا۔ چائے پینے کے بعد وہ ادھر ادھر ٹہل گیا اور پانچ منٹوں بعد زوردار بم دھماکہ ہوا۔ نزدیک کھڑے کچھ لوگ زخمی ہو گئے۔ کچھ اور لوگ ان زخمیوں کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ اتنے میں ایک اور بم دھماکہ ہوا جس کی وجہ سے مرنے

والوں کی تعداد چار اور زخمی ہونے والوں کی تعداد دس بارہ ہوگئی، جس میں زیادہ عورتیں اور بچے تھے۔ جلدی ہی پولس کی گاڑیوں کے ہارن بجنے شروع ہوگئے۔ ڈرائنگ روم میں واپس آکر کسی کے دل نے نہ چاہا کہ وہ دوبارہ اپنے پیالے میں سے چائے کا گھونٹ بھر سکے۔

''ہم تو، پروفیسر بلبیر، ہندوؤں کے محلے میں بیٹھے ہیں۔ کسی وقت کچھ بھی ہوسکتا ہے۔''

''ہوتا وہی ہے جو عام طور پر اس طرح کے موقعوں پر ہوتا ہے۔ پہلے ایک فرقے کے کچھ بے گناہ لوگ مرتے ہیں، پھر دوسرے فرقے کے کچھ بے گناہ لوگ مار دیے جاتے ہیں — حساب برابر۔''

''یہی تو بات ہے، پروفیسر بلبیر، جو دونوں اطراف کے لوگ مارے گئے وہ تو گئے بلا وجہ اس جہان سے۔''

''نہیں، پروفیسر والیہ، ان کی تلافی کروی جاتی ہے۔ مرنے والوں کے لیے بھی رقم مقرر ہے اور زخمی ہونے والوں کی بھی۔ کس کے ساتھ بے انصافی نہیں ہوتی — پورا حق ادا کیا جاتا ہے پھر کسی کو کاہے کا گلہ شکوہ۔''

''یہ سب کچھ تو ٹھیک ہے، پروفیسر بلبیر۔ ویسے تو اپنی سرکار مرنے والوں کے گھر کے صرف ایک ایک فرد کو گنجائش کے مطابق نوکری دیتی ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ملزموں کو کیا سزا ملی؟''

''پروفیسر والیہ اس بات کی فکر ہمیں نہیں کرنی چاہیے۔ جسے یہاں سزا نہیں ملے گی، اسے خدا کے حضور بھگتنا پڑے گا۔ قیامت کے دن بچ نہیں سکے گا۔''

''مسز والیہ نے ازسرنو چائے تیار کی۔ ان کے دونوں بیٹے نیند سے بیدار ہوچکے تھے اور گلی میں اپنے دوستوں سے ملنے اور کھیلنے کودنے کے لیے جانا چاہتے تھے لیکن ان کے دوست بھی ان کی طرح اپنے اپنے گھروں میں بند تھے۔ میں بھی تو وہاں بند ہوکر رہ گیا تھا، نہیں تو میں نے بھی اب تک بس اسٹینڈ پہنچ جانا تھا۔ میں یہاں ایسے ہی ملنے جلنے کے

لے آیا تھا۔ اب بری طرح پھنس گیا تھا۔ پھر بھی یہاں سے جانے کا کوئی راستہ نکل سکتا تھا۔ ویسے یہاں بھی رات کاٹی جاسکتی تھی۔ اپنا بڑا گہرا دوست تھا۔''

''پروفیسر بلبیر، اب آپ کپڑے وغیرہ بدل کر ذرا ریلیکس ہو جائیں۔ کل صبح چلے جانا۔ رات کو تھوڑی تھوڑی پئیں گے اور ساتھ ہی میں نے ایک نئی ویڈیو کیسٹ لائی ہوئی ہے۔''

''اگر نہ جا سکا تو کوئی بات نہیں، اس گھر کو میں اجنبی گھر نہیں سمجھتا۔''

''بڑی مہربانی ہے، آپ کے یہاں آنے سے ہم سبھی کو بڑی دلی خوشی محسوس ہوتی ہے۔''

''ویسے پروفیسر والیہ، مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے ہم لوگ اس سرزمین پر اجنبیوں کی طرح ہوں۔ ہر کوئی ہماری طرف شک بھری نظروں سے دیکھتا ہے۔ میں پنجاب سے باہر کی بات نہیں کر رہا، وہاں تو ہماری کوئی پوچھ تاچھ بالکل ہی نہیں۔ یہاں پنجاب میں بھی ہمارے بھائی بہن ہمیں شک بھری نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔''

''ٹھیک ہے آپ کی بات۔ ویسے جہاں جان پہچان ہے، واقفیت ہے، وہاں تو میل جول قائم ہے۔ ویسے ہر کیس دھاری اجنبی بندے کو خطرناک آدمی تصور کیا جاتا ہے — یہ بڑی بُری بات ہے۔''

''ویسے، پروفیسر والیہ، کوئی ان سے پوچھے کہ اس ملک کے اتحاد اور سالمیت کے لیے سکھوں سے بڑھ کر اور کون ہمدرد ہیں۔ پاکستان بننے کی جتنی مخالفت سکھوں نے کی تھی، کسی اور نے نہیں کی تھی۔ نتیجتاً سب سے زیادہ مار بھی سکھوں نے ہی کھائی۔''

''پروفیسر بلبیر، پنجاب کے سبھی باشندے اگر اپنے آپ کو پوری طرح اس صوبے کے ساتھ جوڑ لیں اور اس کے مفادات کا تحفظ کریں تو سارے مصائب دور ہو سکتے ہیں اور سارے دکھ درد ختم ہو سکتے ہیں۔ مشکل اس وقت نظر آتی ہے جب ہم اپنوں سے منہ موڑ کر دوسرے صوبوں کے باشندوں سے ہمدردی کے خواہاں ہوتے ہیں یا خود بخود ان کے تئیں قرب ظاہر کر کے مذہبی رشتے کی دہائی دینے لگتے ہیں۔''

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بیرونی دروازے پر کسی نے بڑے زور سے دستک دی۔ یہ آواز سن کر ایک مرتبہ تو سبھی کے دل دہل گئے۔ پھر کچھ وردی میں ملبوس بندوں نے ڈرائنگ روم کے شیشوں میں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ دستک دینے کے بعد وہ خود ہی دروازہ کھول کر اندر آ گئے تھے۔ پروفیسر والیہ نے اندر کا دروازہ کھولا۔ چار پانچ باوردی آدمی دگڑ دگڑ کرتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔

''یہاں کون رہتا ہے؟''

''جی، ہم رہتے ہیں — یہ میرے دوست پروفیسر بلبیر ہیں، لدھیانہ سے آئے ہیں۔''

''کب آئے تھے آپ؟''

''تین چار دن ہونے کو ہیں۔''

''یہاں آپ کا کیا کام ہے؟''

''جی، ہمارا یہاں گھر ہے، اپنے دوستوں سے ملنے آیا تھا۔ آج واپس جا رہا ہوں۔''

''پھر گئے کیوں نہیں؟''

''بم دھماکوں کی وجہ سے رک گیا۔ پتا نہیں بسیں جا بھی رہی ہیں یا کہ نہیں؟''

''آپ ادھر بھائیاں کے شوالے کی طرف گئے تھے؟''

''میں بم دھماکوں سے کوئی آدھا گھنٹہ پہلے وہاں سے گزرا تھا۔''

''ہوں — آدھا گھنٹہ پہلے۔ ادھر مندر کے پاس سے گزر کر آئے ہوں گے؟''

''ہاں — راستہ ہی وہی ہے۔''

''چلو ہمارے ساتھ۔''

''کہاں —؟''

''کوتوالی — اور کہاں۔''

''کیوں —؟''

''پوچھ تاچھ کرنی ہے آپ سے۔''

''جی، یہ میرے دوست ہیں۔'' پروفیسر بھانپ گئے تھے کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔

''یہ پروفیسر بلبیر ہیں، سرکاری کالج میں انگریزی پڑھاتے ہیں، رائٹر ہیں — سربت کا بھلا چاہنے والے۔''

''ہم بھی سربت کا بھلا چاہتے ہیں، سردار جی، ہم نے اپنی ڈیوٹی بھی تو کرنی ہے — انھیں ہمارے ساتھ چلنا ہی پڑے گا۔''

میں تین سکھ پولس والوں اور دو سی آر پی ایف کے جوانوں کے ساتھ باہر کھڑی جیپ میں بیٹھ گیا۔ اپنا چھوٹا سا اٹیچی کیس بھی میں نے اپنے ساتھ ہی رکھ لیا۔ ان کو یہ بات بری لگی لیکن کسی نے روکا نہیں۔ ایک ہچکولے کے ساتھ جیپ چل پڑی۔ میں نے ہاتھ ہلا کر پروفیسر والیہ کو الوداع کہنی چاہی لیکن کسی نے میرا ہاتھ نیچے کر دیا۔ جاتے جاتے میری نظر ڈرائنگ روم کے شیشوں پر پڑی، اندر مسز والیہ اور بچے بڑے سہمے ہوئے کھڑے تھے۔

''پولس کی جیپ دو تین موڑ کاٹ کر 'شوالہ بھائیاں' کے آگے جا کر کھڑی ہوگئی۔ وہاں کچھ اور جیپیں بھی کھڑی تھیں اور ان میں میرے جیسے آدمی بھرے ہوئے تھے۔ اتنے میں ریلوے پھاٹک کی طرف سے لوگوں کا ہجوم آتا ہوا دکھائی دیا۔ یہ لوگ بہت بھڑکے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھوں میں کئی طرح کے ہتھیار تھے۔ پولس اور سی آر پی ایف نے ان کو روکنے کی کوشش کی لیکن ان لوگوں نے پولس کے خلاف نعرے لگانے شروع کر دیے۔ لوگوں کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر پولس والے جلدی جلدی جیپوں میں چڑھ گئے اور جیپیں ایک دوسرے کے آگے پیچھے دوڑنے لگیں۔

پانچ سات منٹوں میں ہی وہ جیپیں ٹاؤن ہال جا پہنچیں اور ہمیں جیپوں میں سے اتار کر کوتوالی کے اندر بھیج دیا گیا۔ اتنے سال بعد وہاں پہنچ کر مجھے اجنبی پن کا احساس بالکل نہ ہوا۔ اڑتیس سال پہلے رات کے گیارہ بجے ہماری گلی کے سبھی افراد کو اسی جگہ پر امن میں خلل ڈالنے کی پاداش میں لایا گیا تھا۔ سن سینتالیس میں مئی کی بائیس تاریخ کی رات میں نے اسی کوتوالی میں کاٹی تھی۔ اب پھر وہی آثار نظر آرہے تھے۔ اس وقت کی طرح اب ہمیں کوتوالی میں اکڑوں بیٹھنے کے لیے نہ کہا گیا بلکہ ہم وہاں رکھے ہوئے لکڑی کے بینچ پر

بیٹھ گئے۔ اس وقت آدمی بھی تیس پینتیس تھے۔ اب تو ہم بمشکل پندرہ ہی تھے۔ اس وقت میں بے دھڑک تھا کیونکہ وہ لوگ ہماری گلی کے ہی تھے۔ اب بات بالکل ہی برعکس تھی۔ ان میں سے میں کسی کو پہچانتا نہیں تھا۔ پہچاننا تو ایک طرف رہا، یہ سب لوگ میرے لیے پوری طرح اجنبی تھے بلکہ یہ سب مجھے مخالف نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی اپنی جان بچانے کی خاطر کہہ سکتا تھا کہ وہاں وہ بم میں نے رکھے تھے۔ کئی گواہ بھگت سکتے تھے اور مجھ پر سنگین جرم والی دفعہ لگ سکتی تھی۔ کسی بے گناہ کو گنہگار ثابت کر دینا بڑی آسان بات تھی لیکن کسی دوسرے کے لیے اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنا مشکل تھا۔ میں کیسے ثابت کرتا کہ وہ بم میں نے نہیں رکھے تھے اور جھیل سے پانی پینے کے بہانے غائب ہوا آدمی میں نہیں تھا؟ شکلیں ایک دوسرے کے ساتھ ملتی جلتی ہو سکتی تھیں۔ کئی کی آنکھیں دھوکہ کھا سکتی تھیں۔ مجھے تو اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنا بھی غالباً آدھا گناہ قبول کر لینے والی بات دکھائی دیتی تھی۔ یہ ہتک میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ کسی کا میرے اوپر شک ہونا اور وہ بھی اس قسم کا، میرے لیے بہت ہی مضحکہ خیز بات تھی۔

بینچ پر بیٹھے بیٹھے میری ٹانگیں اکڑ گئیں۔ دو تین مرتبہ میں نے وہاں سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ہمت نہ ہوئی۔ میرے ساتھی لوگ بہت سہمے ہوئے اور بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ ہمارے اردگرد سخت پہرہ تھا۔ دوسرے کمرے میں پولس افسروں کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بار بار بج رہی تھی۔ باہر سڑک پر شعبہ تعلقات عامہ کی جیپ اعلان کر رہی تھی کہ وریکا کی چونگی سے لے کر حسین پورہ کے چوک تک کرفیو لگا دیا گیا تھا۔ تھوڑے عرصے کے بعد یہی گاڑی پھر پوری رفتار سے ادھر سے گزری۔ وہاں بیٹھے ہوئے، کھڑکی کے شیشوں میں سے مجھے سڑک نظر آ رہی تھی۔ باہر بہت سارے لڑکے چھوٹی ٹولیوں میں کھڑے تھے۔ آہستہ آہستہ باہر کی طرف دن کی روشنی کم ہو رہی تھی اور میرا اندیشہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ماسوائے چھوٹے سے ایک گھرانے کے کسی کو پتہ نہیں تھا کہ پولس مجھے پکڑ کر لے گئی ہے۔ اسی رات کو اگر مجھے ہلاک کر دیا گیا تو اگلی صبح کو پانی کا ایک بلبلہ حیات کے اس سمندر میں سے غائب ہو گا اور کچھ نہیں۔

بادشاہ کے تئیں ضرورت سے زیادہ وفاداری کا مظاہرہ کرنے والوں کی کمی کسی دور میں بھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ انگریزوں کے وقت بھی لوگ اپنی ڈیوٹی کے اتنے پابند تھے کہ وہ ہمیشہ ہم وطنوں پر تشدد کے نئے موقعوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ موقع ملنے پر وہ اگلی پچھلی ساری کمی پوری کر دیتے تھے۔ اب تو اس طرح کی بات کی امید نہیں تھی، کیونکہ اب تو ہندوستان آزاد ہو چکا تھا اور ان لوگوں کے سلوک میں تبدیلی آنے کی امید تھی۔ ہمارے چوک کے نزدیک پیپل والی گلی والا نوڈی بچہ شادی لال کب کا مرکھپ چکا تھا اور لوگ، بے شمار غلط فہمیوں کے شکار لوگ — ہلاکو، چنگیز، تیمور، نادرشاہ اور احمد شاہ ابدالی۔ پنجاب کی یہ سرزمین، یہ مٹی، یہ پانی، یہ ہوا، درختوں کے یہ جھنڈ، پکی ہوئی فصلوں کی یہ شکل وصورت، جذبات کی یہ شدت، خیالات کی یہ گہرائی۔ یہ سب کچھ ابھی قائم تھا، ابھی تک یہ قائم و دائم تھا، کیوں؟ اس لیے کہ کچھ لوگ گھپ اندھیرے میں بھی سچائی کے جگنو کو اپنی مٹھی میں بند کر لیتے ہیں، سنبھال لیتے ہیں۔ جیسے کوئی اپنے آنسو اپنے دامن میں تھام رہا ہو، تاکہ ان کی گرماہٹ صدیوں تک قائم رہ سکے۔ وقت آنے پر یہی گرماہٹ یا تپش پہلے چنگاری کی شکل اختیار کرتی ہے پھر آگ کی لپٹوں میں نمودار ہوتی ہے۔ 'کوڑ نکھٹے نانکا اوڑک سچ رہی' مراد اے نانک باطل مٹ جانے والا ہے آخر کو فتح سچ کی ہی ہوتی ہے۔

''چلو، ایک ایک کر کے اندر آؤ''، ایک گرج دار آواز ابھری۔ اندرونی کمرے میں پولس والوں کی میٹنگ ختم ہو چکی تھی۔ اب ہمارے متعلق ضروری کارروائی ہونے والی تھی۔ پہلی کارروائی تو نام اور پتا نوٹ کرنے کی تھی۔ دوسری کارروائی ہمیں اپنے اپنے جرموں کا اقبال کرنے کا موقع دینے کی تھی۔ تیسری کارروائی جیل بھگتنے کے لیے ہمیں نفسیاتی طور پر تیار کرنے کی تھی۔ آخری کارروائی گولی کی سنسناہٹ کو سن کر خاموش ہو جانے کی تھی — چپ اختیار کر لینے کی۔ ابھی صرف پہلی کارروائی ہوئی تھی، خانہ پری کرنے والی، ڈر کا احساس کروانے والی۔ وہاں بیٹھے بیٹھے ہمیں پتا لگ گیا تھا کہ شہر میں دنگے فساد ہو رہے تھے، اکا دکا مارے جا رہے تھے، کہیں کہیں دکانیں جل رہی تھیں۔ وحشت کا ماحول بن چکا تھا۔ بھٹکے لوگ، پاگل لوگ، جذباتی لوگ، اجل بن کر گھوم رہے لوگ، مذہب کے محافظ

لوگ، لوگ ہی لوگ — صرف لوگ۔ ان میں سے کوئی انسان کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ انسانیت تڑپ رہی تھی، ورلاپ کر رہی تھی یا دکھ درد جھیل رہی تھی۔

وہاں سے ہمیں رات کے اندھیرے میں انٹروگیشن سینٹر لے جایا گیا۔ بہت بڑا احاطہ تا تنگ شاہی اینٹوں والی عمارت، ہر کمرے میں ایک افسر اور ایک مجرم۔ سوالوں کا سلسلہ، جوابوں کا تانتا، کڑک، گرج، چانٹے، چھانٹے، سسکیاں، آہیں، منتیں، وڈ وڈ کی آوازیں، آوازیں خوشامد کرنے کی، حاکمانہ لہجے کی آوازیں، آوازیں جرم کا اقبال کروانے والی، آوازیں اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کی۔ اس طرح رات کے گیارہ بج چکے، ایک ایک کمرے کی بتیاں بجھنے لگیں۔ بے بسی نے اپنے گھونسلے میں ڈیرا جمانے سے پہلے ہی اپنے پر پھڑ پھڑائے۔ جو جہاں تھا، وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ نیند کا غلبہ، بیٹھے بیٹھے سونے کا سوانگ۔

وہ رات گزرنے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ جسم پر تو کوئی ضرب نہیں لگی تھی البتہ دماغ پوری طرح پریشان تھا۔ جیسے کسی نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہو۔ تابڑتوڑ سوال اور نامکمل جواب سنتے ہی اگلا سوال۔ ایک نہ ختم ہونے اور ٹوٹنے والا سوالوں کا سلسلہ —

''آپ کیا کرنے گئے تھے وہاں؟''

''میں اپنے دوست کو ملنے گیا تھا۔''

''آپ کو ان سے کیا کام تھا؟''

''کوئی خاص کام نہیں تھا۔''

''بغیر مطلب کے کسی کے یہاں جانے کا مطلب؟''

''ملنے جلنے، گپ شپ۔''

''لڑکے جو کچھ کر رہے ہیں کیا اس کی حامی بھرتے ہو؟''

''میری طرف سے حامی بھرنے یا نہ بھرنے کا کوئی مطلب نہیں۔''

''کیوں—؟''

''اس لیے کہ میں صلح صفائی کے ساتھ مسئلے کو حل کرنے کے حق میں ہوں۔''

''لیکن یہ جو کچھ بغیر مطلب کے ہی اٹھائے پھرتے ہیں۔''

''یہ شاید 'تنگ آمد بجنگ آمد' والی بات ہو۔ ہر مسئلے کا دوسرا پہلو بھی تو ہوتا ہے۔''

''کون انھیں تنگ کر رہا ہے؟''

''سسٹم — جس کی سوچ ایک طرفہ ہے۔''

''کیا مطلب —؟''

''مطلب یہ کہ جب دو فرقوں میں ٹھن جائے تو دونوں کی بات سننی چاہیے یہ نہیں کہ روٹھے ہوئے طبقے کو نظرانداز کر دیا جائے۔''

''اپنا نظریہ پیش کرنے کے کئی دوسرے وسیلے بھی تو ہو سکتے ہیں۔ پھر ہتھیار اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟''

''ہمیں ٹھنڈے دل و دماغ سے ان کی بات بھی سن لینی چاہیے۔ ہم اپنے کالجوں میں یہی طریقہ اپناتے ہیں۔''

''کالجوں کی بات اور ہے، ویسے وہاں بھی لڑکے پروفیسروں کو پیٹ دیتے ہیں یا عمارت کو نقصان پہنچاتے ہیں۔''

''کوئی بھی اچھا طالب علم یہ کام نہیں کرتا۔ جہاں کہیں بھی ایسا ہوتا ہے وہاں دوسرے اداروں کے ہی لڑکے ایسا کچھ کرتے ہیں۔ کبھی کبھی اس کالج کے کچھ لڑکے بھی ان کے بہکاوے میں آجاتے ہیں۔''

''اس وقت آپ کیا کرتے ہیں؟''

''اس وقت ہم اپنے طلبا کو ان سے الگ کرتے ہیں۔ پھر ان کے ساتھ بات چیت کا سلسلہ بحال کرتے ہیں، ان کی جائز مانگیں فوراً مان لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے مفاد کی باتیں جن کے متعلق انھیں بھی علم نہیں ہوتا، لاگو کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''پھر کیا ہوتا ہے؟''

''ایک خوشگوار ماحول قائم ہو جاتا ہے، ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے، رسہ کشی ختم ہو جاتی ہے۔''

"یہ کام اتنا آسان نہیں۔"

"آسان اس وقت نہیں رہتا جب نیت صاف نہ ہو۔ مثال کے طور پر، اگر امتحان میں کچھ طلبا کو نقل کرنے کی اجازت دے دوں اور باقی کو منع کروں اور ذرا سی ہلچل کرنے والوں پر کیس بنا دوں تو وہ میرے خلاف ہو جائیں گے۔ سختی کرنے والے اساتذہ کی تو شرارتی طلبا بھی عزت کرتے ہیں لیکن بے ایمان کی نہیں، چاہے وہ کتنی ہی چکنی چپڑی باتیں کرتا ہو۔ شوشے چھوڑنے والوں کا ہمیشہ ہی برا حال ہوتا ہے۔ انجام کار وہی بات ہوتی ہے جو —"

"بند کرو یہ بکواس، خاموش ہو جاؤ — ورنہ آپ کا منھ توڑ دوں گا۔"

دگڑ دگڑ کرتا ہوا وہ چلا گیا۔ وہاں سے اٹھ کر میں باہر آ گیا۔ برآمدے میں ایک بینچ پڑا تھا میں اس پر بیٹھ گیا۔ سنتری نے میری طرف گھور کر دیکھا مگر خاموش رہا۔ وہ بڑی بھیانک رات تھی، بار بار میرا خیال گھر کے افراد کی طرف جاتا۔ اگر اس رات کی صبح نہ ہوئی تو وہ کیا کریں گے؟ کدھر جائیں گے۔ ابھی ہمارے گھر کا کام مکمل نہیں ہوا تھا۔ ویسے یہ سلسلہ کبھی ختم تو نہیں ہوتا، پھر بھی زندگی کی کہانی کو کسی خوبصورت موڑ پر چھوڑ دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔

مرنا مشکل کام تھا لیکن بلاوجہ مارے جانا اور بھی تکلیف دہ واقعہ تھا۔ پھر اس جگہ پر مارے جانا جس کے پاس سے میں بالمکند کھتری اسکول جانے کے لیے ہر روز صبح کے وقت سائیکل پر گزرا کرتا تھا۔ یہ واقعہ اگر پردیس میں واقع ہوتا تو کوئی خاص بات نہیں تھی۔ وہاں کسی سے بھی ہمدردی کی امید نہیں رکھی جا سکتی۔ لیکن یہاں تو پتا پتا، بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے' والی بات تھی۔ شاید یہ میری خوش فہمی ہی تھی۔ یہاں بھی اب سارے ایک ایک کر کے اجنبی بن چکے تھے۔ کسے پتا تھا یا کسے خبر تھی کہ اس وقت میرے ساتھ کیا بیت رہی تھی۔ سب لمبی تان کر گہری نیند سو رہے تھے:

شہیدوں کی چتاؤں پر لگیں گے ہر برس میلے

بیشک لگیں گے لیکن میں نے کدھر کا شہید بن جانا تھا:

یہ کس کا لہو ہے کون مرا

یہ بات بھی کسی نے نہیں پوچھنی تھی۔

میری بیوی میرے دیر سے گھر پہنچنے پر ہی اداس ہوجاتی تھی، لیکن اگر اسے معلوم ہوجائے کہ اب میں نے گھر پہنچنا ہی نہیں تو اس کے دل پر کیا گزرے گی؟ یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہوئی تھی۔ پھر اس دور میں جبکہ اس بات کا کسی کو پتا نہیں کہ اس شام کی صبح یا اس صبح کی شام ہوگی کہ نہیں۔ میرے چلے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، کوئی کام بند نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی کہیں نہ کہیں کچھ فرق تو ضرور پڑتا ہی تھا — ایک دراڑ سی ایک کج (چبھن) سا۔

ایک مرتبہ آدھی رات کے وقت گردے کے آپریشن کے دنوں میں میری آنکھ کھل گئی تھی — بیہوشی کے بعد ہوش میں آتے ہی میری آنکھیں کھل گئی تھیں، جیسے اچانک کسی نے بڑے زور سے دروازے کے دونوں کواڑ کھول دیے ہوں۔ میں نے دیکھا جتندر، میری بیوی، میرے سرہانے کے پاس اسٹول پر بیٹھی، سامنے والی دیوار کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی۔ اس طرح جیسے وہ خلا میں اپنے ہی مستقبل کی شکل وصورت کو اپنے سامنے دیکھ رہی ہو۔ اس کے چہرے پر کسی مضبوط ارادے کے خطوط ابھرے ہوئے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے میں اپنی موت کے بعد اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ وہاں زندگی کے ساتھ نبرد آزما ہونے کی جھلک دیکھ کر میرے دل کو تسلی ہوئی۔ میرے لیے زندہ رہنا زمانۂ حال کی بات کبھی بھی نہیں تھی۔ بلکہ یہ مستقبل کا خواب بن چکا تھا۔ وہ بھی میری طرح اپنے بھولے پن میں اسی طرح کے خواب لینے لگی تھی۔ خواب شرمندۂ تعبیر بھی ہوجاتے ہیں لیکن وقت گزرنے کے بعد۔

کسی روشن مستقبل کی ناختم ہونے والی امیدوں کے سہارے ہی جتندر صحراؤں میں میرے ساتھ چل پڑی تھی۔ ان امیدوں کی دوسری حد کا مجھے پتا تھا لیکن اس لیے کہ یہ حد کبھی بھی مقرر نہیں ہوسکی تھی۔ یہ راستے ہمارے پیروں کے ساتھ جڑے ہوئے تھے:

اگم اگو جو جیج انہاں دی رستے نیں اسگاہ

یعنی جو (عشق حقیقی) کے راستے ہیں یہ لامتناہی ہیں اور ان کی کشش الامکان ہے۔
مجھے تو اس تلخ حقیقت کا پتا تھا کہ وہ صبح جس کا ہمیں ایک مدت سے انتظار تھا کبھی نہیں آئے گی لیکن میری بیوی کسی نہ کسی طرح ہر نئی صبح کو اس خیالی صبح کے ساتھ جوڑ لیتی تھی۔
اب جب کچھ دیر کے لیے زندگی کے دشوار گزار راستوں پر ستانے کا موقع حاصل ہوا تھا، یہ رات میری زندگی کی آخری رات بنتی نظر آ رہی تھی۔ یہ لوگ جو مجھے پکڑ کر یہاں لے آئے تھے، وہ میرے منھ سے کچھ کہلوانا چاہتے تھے جو میرے بس کی بات نہیں تھی۔ اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنا بھی مجھے ذلیل کام لگ رہا تھا:

حبک سربن کے کیا پوچھیں ہم سے سرگراں کیوں ہو

میں یہ باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ کوئی بیچ پر آ کر میرے پاس بیٹھ گیا—

''اتنی مایوسی آپ کے چہرے پر نہیں جچتی۔''

''اپنے لیے نہیں بلکہ میں تمھارے لیے اتنا فکرمند ہوں۔''

''آپ ہماری فکر نہ کریں، حوصلہ رکھیں۔ کوئی نہ کوئی صورت یہاں سے نکلنے کی نکل ہی آئے گی۔''

''یہاں میرے جیسے اور بھی کئی لوگ ہیں، ان کا کیا ہوگا؟''

''آپ ہمیشہ دوسروں کے بارے میں ہی کیوں سوچتے رہتے ہو؟ کسی وقت اپنے متعلق بھی سوچ لیا کرو۔''

''کیا فرق ہے، میری جان؟ دوسروں کے بارے میں سوچنا بھی ایک طرح سے اپنے متعلق سوچنا ہی ہوتا ہے۔''

''اچھا، یہ بتاؤ کہ آپ مجھ سے کسی بات کو لے کر ناراض تو نہیں؟''

''بلکہ بات اس کے برعکس ہے۔ قصوروار میں ہوں تم نہیں۔''

''آپ کا اسی بات کی طرف اشارہ ہے نا کہ آپ گھنٹوں کی آواز ہی سنتے رہ گئے اور تیز چلنے والی 'لیلیٰ' تک پہنچ گئے؟ اور تو کوئی دوسری بات نہیں نا؟''

''یہ وہ 'لیلیٰ' نہیں جس کی طرف تم اشارہ کر رہے ہو۔ یہ دوسری 'لیلیٰ' ہے۔

''اچھا — میرا تو خیال تھا کہ ایک ہی 'لیلیٰ' ہے۔ اب پتا لگا ہے کہ دوسری بھی ہے۔''

ایک قہقہہ، ایک ہنسی، ایک جھنکار۔ اس کے ساتھ رات کا سناٹا اور بھی گہرا ہو گیا۔ گیٹ پر کھڑا اسنتری بھی اونگھنے لگا۔ اس عمارت میں کئی گیٹ تھے اور آخری گیٹ رام باغ کے چوک میں کھلتا تھا۔ اس کے باہر مچھلی بیچنے والوں کی دکانیں تھیں اور نزدیک ہی شراب کے ٹھیکے تھے۔ دیسی کے بھی اور انگریزی کے بھی۔ چوک کے دوسری طرف، اس عمارت کے گیٹ کے بالکل سامنے بہت پرانی پولس چوکی تھی۔ اس وقت میرا دل باہر نکل کر گھومنے پھرنے کو چاہتا تھا۔ میں چترا ٹاکیز تک جانا چاہتا تھا یہاں پر کبھی میں نے 'پکار' دیکھی تھی، پھر 'سکندر'، پھر 'خزانچی'، پھر 'منگنی'۔ وہ وقت تھا دنیا کو ڈھونڈنے کا اور یہ رات تھی دنیا کو بھولنے کی۔ پتا نہیں یوں لارڈ بائرن کی نظم 'دی پرزنرز آف شیلون' مجھے بار بار یاد آرہی تھی۔ کہیں میرا بھی یہاں وہی حال نہ ہو؟ نہیں نہیں — بالکل نہیں۔

''چلو آؤ میڈم، اب تھوڑی دیر کے لیے ہنسیں۔''

''کس بات پر؟''

''کسی بھی بات پر۔''

''جیسے ہم اس وقت ہنسے تھے جب ہمارا اٹیچی بس کی چھت پر سے گم ہو گیا تھا؟''

''اس وقت تو میڈم، ہمارا سب کچھ لٹا کر ہنسنے والا حال تھا۔''

''یہ سب کچھ اس وجہ سے تھا سر کہ ہم دربدر دھکے کھاتے رہے۔''

''کیوں نہ کھاتے، جب ہمارے پیروں میں زنجیر نہیں، بلکہ چکر تھا۔ ہم عام طور پر ان مقامات کا ذکر کر لیتے ہیں، جہاں ہم رہے، لیکن ان ٹرکوں کا ذکر نہیں کرتے جن میں ہم اہل خانہ سمیت ڈیرا لگاتے رہے۔''

''سر، آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے۔ کپورتھلہ سے جب ہم لدھیانہ ساری فیملی اور پورے سامان کے ساتھ ٹرک میں آئے، تو مجھے بڑا عجیب لگا۔''

''ویسے تو، میڈم ہم پہلے بھی اسی طرح کرتے رہے تھے لیکن اس مرتبہ بچے بڑے

ہو چکے تھے، تینوں ہی کالجوں میں پڑھتے تھے اور ساتھ ہی سامان بھی اچھا خاصا ہو گیا تھا۔"

جب لدھیانہ کی چونگی سے گزر چکے تو شکر کیا تھا، ورنہ وہاں بھی کوئی اڑچن آ جاتی۔ آگے جو مکان آپ نے کرایے پر لیا تھا، وہ کسی دوسرے کرائے دار کے پاس جاتے جاتے بمشکل بچا تھا۔ اگر سر، ہمارے آنے تک اس مکان میں کوئی اور آ چکا ہوتا تو ہم اس ٹرک کو کدھر کھڑا کرتے۔

"وہ تو چلو اچھا ہوا میڈم کہ بچاؤ ہو گیا۔ ایک بات اور ٹرک میں اس طرح سامان بمع پورے گھرانے کے لے جاتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے ہمارے گھر کو پہیے لگے ہوں۔ اگر راستے میں ٹرک خراب ہو جاتا تو ہم نے کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر بوری میں سے تھوڑا سا سامان نکال کر چائے تیار کر لینی تھی۔"

"آپ کا مطلب ہے سر، کہ اگر وہاں بھی آپ مجھے چائے بنانے کے لیے کہہ دیتے تو جنگل میں منگل ہو جاتا تھا — اور کچھ نہیں تو آپ کو اپنی کہانی کے لیے ایک نیا پلاٹ مل جاتا۔"

رات بہت اندھیری تھی۔ دو بج چکے تھے۔ اس بینچ پر میں سیدھا لیٹ گیا کیونکہ اس پر کروٹ لینا ممکن نہیں تھا۔ میرے ساتھ گرفتار کیے گئے لوگ پتا نہیں کہاں چلے گئے تھے، شاید انھیں چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ صرف میں ہی ان کی نظروں میں دہشت گرد تھا۔ ضرور ہوں گا نہیں تو انھوں نے مجھے بھی چھوڑ دینا تھا۔ انسان کی شکل سے اس کی سیرت کا پتا لگ جاتا ہوگا، تبھی تو جگر مراد آبادی نے کہا تھا:

جگر میں نے چھپایا لاکھ اپنا درد و غم لیکن
بیاں کر دیں میری صورت نے سب کیفیتیں دل کی

"چلو بھئی، گوراندر جیت تھوڑی دیر کے لیے باہر سیر کر آئیں۔"

"جیسے آپ کی مرضی، ڈیڈی۔ ویسے یہ سیر مجھے اچھی نہیں لگتی۔"

"کیوں —؟"

"کیا ایسے ہی سڑکوں پر گھومتے ہوئے لوگوں کی کوٹھیوں کی طرف دیکھتے جاؤ۔"

''تمھیں پتا ہے شیکسپیئر نے اس کے بارے میں کیا کہا ہے؟''

''جی نہیں—''

''مسافر وہ ہوتے ہیں جو اپنی زمین بیچ کر دوسروں کی زمینیں دیکھنے نکلتے ہیں۔''

''پہلے اس مسافر کے پاس گھر سے باہر نکلنے کے لیے زمین تو ہونی چاہیے۔''

''زمین سے تمھاری مراد، کوٹھی کی تعمیر کرنے کے لیے پلاٹ سے ہے؟''

''ہاں ڈیڈی—''

''لیکن شرط یہ ہے کہ پلاٹ حلال کی کمائی کے ساتھ خریدا گیا ہو۔''

''دوسری کمائی کون سی ہوتی ہے، ڈیڈی؟''

''جس کا حساب بہی کھاتوں میں نہ ہو۔ نوکری پیشہ حضرات اسے بالائی آمدنی کہہ لیتے ہیں۔''

''آپ تو پرانے زمانے کی بات کرتے ہو، ڈیڈی اب زمانہ بدل چکا ہے۔''

''زمانہ تو بیٹا، پہلے بھی کئی مرتبہ بدلا ہے، اب کوئی نیا نہیں بدلا۔''

''ٹھیک ہوگی آپ کی بات لیکن اس دور میں جتنی بھی ترقی ہوئی ہے اسی ڈھنگ کے ساتھ اسی طرح ہوئی ہے۔''

''مجھے تو اتنا ہی پتا ہے گوریندر جیت کہ ٹھیک بات ٹھیک ہوتی ہے اور غلط بات غلط۔ میرے کچھ اصول ہیں کچھ آدرش ہیں جن کی تعمیل کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔''

اس طرح کی باتیں کرکے اپنے کسی بیٹے یا بیٹی کو خاموش کر دینا مشکل بات نہیں ہوتی۔ بنے بنائے فقروں یا چلینج چیوڈز میں اتنا زور تو ہوتا ہے کہ دوسرا آدمی کچھ نہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو جائے۔ آرتھر ملر کو یہ کیا سوجھی کہ اس نے ایک باپ کو کار حادثے میں مرتا دکھایا تاکہ اس کے دونوں بیٹوں کے بیمے کے روپے مل جائیں۔ اس مسئلے کا یہ کس طرح حل ہوا؟ پرانی نسل ابھی تک نئی نسل کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ گھوم پھر کر اس میں بھی اپنے مستقبل کی جھلک دیکھ رہی تھی۔ یہ اس نسل کی اپنی بے بسی اور لاچاری کا چینگ اوور سا تھا۔

میں اٹھ کر بینچ پر بیٹھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے میں اونگھنے لگا۔ اونگھتے ہوئے میرے سر کو جب جھٹکا سا لگتا تو میں اپنے چاروں طرف دیکھتا، جیسے کوئی مسافر اس حالت میں بس یا گاڑی میں بیٹھا دیکھتا ہے لیکن مرے اردگرد اس وقت کوئی نہیں تھا۔ وہ سنتری بھی پتا نہیں کب کا کہیں جاچکا تھا۔ تین بج چکے تھے۔ میں نے اپنے دونوں پاؤں بینچ پر رکھ کر اپنے گھٹنوں میں سر رکھ لیا۔ اب تو جیسے مجھے اپنا سر بھی کندھوں پر ہی ایک بوجھ سا لگنے لگا تھا۔ آنکھیں بند کرتے ہی جیسے مجھے اپنے وجود کا احساس نہ رہا۔ شاید میرے شعور ہی نے مجھے اس زمین کے ساتھ اس کائنات کے ساتھ جوڑ کر رکھا ہوا تھا۔ پھر مجھے یوں لگا جیسے میں سمندر کی لہروں پر کبھی ادھر کبھی ادھر ہچکولے کھا رہا ہوں، ایک جھولے کی طرح ایک پنگوڑے کی طرح:

"سُنیئے سرا گنا کے گاہ
سُنیئے شیخ پیر پات ساہ
سُنیئے اندھے پاوہ راہ
سُنیئے ہاتھ ہووے اسگاہ
نانک بھگتا سدا وگاس
سُنیئے دُوکھ پاپ کا ناس

مراد پربھو (خدا) کے ذکر کو مسلسل سنتے رہنے سے دنیا بھر کی خوبیاں اور اچھائیاں حاصل ہوجاتی ہیں۔ اس کا ذکر سننے سے بڑے بڑے شیخوں، پیروں اور شہنشاہوں کا منصب حاصل ہوجاتا ہے۔ دنیا کے بھیدوں اور الجھنوں کو نہ سمجھنے والے عقل سے اندھے لوگوں کو بھی ذکر سن کر صحیح راستے کی تلاش کرنی آجاتی ہے۔ ان کے شکوک اور مشکلوں کا نپٹارا ہوجاتا ہے۔ وہ حقیقت کو پالینے کا ہنر جان لیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ علم کی حقیقت کو پالیتے ہیں۔ گورو نانک دیو جی فرماتے ہیں کہ خدا کے بندے کبھی بھی اداس یا مایوس نہیں ہوتے۔ انھیں کوئی دکھ یا پاپ چھو بھی نہیں سکتا۔

سنتری دوبارہ اپنی کرسی پر آبیٹھا۔ وہ ڈھاٹھا باندھتے ہوئے پاٹھ کر رہا تھا۔ اس کے

ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ مجھے اپنے بدن میں گوربانی کا سنچار ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ میں مستعد ہو کر بیٹھ گیا۔ اس ماحول میں بانی کا ہمرن مجھے کچھ عجیب سا لیکن بہت اچھا لگا۔ پھر میں وہاں سے اٹھ کر نلکے تک گیا، ہاتھ منہ دھویا، کلی کی اور دو گھونٹ پانی پیا۔ ایسے محسوس ہوا جیسے میری آنکھیں پوری طرح کھل گئی ہوں۔ میری نظر اوپر آسمان کی طرف گئی۔ وہاں ابھی تک کوئی کوئی ستارہ نظر آ رہا تھا۔ ان ستاروں کی لو کسی جوت کی مانند تھی — وہ جوت جو گوردوارہ میں روشن ہوتی ہے، مندر میں روشن ہوتی ہے، اس جوت کا انسانی دلوں میں ہر لمحہ، ہر گھڑی روشن ہونا بہت ضروری تھا۔

''چائے پیو گے، سردار جی؟'' پاٹھ ختم کر کے اس سنتری نے مجھے پوچھا۔

''مل جائے تو ٹھیک ہے، لیکن —''، مجھے ابھی بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ سنتری میرے ساتھ ہی بات کر رہا تھا۔

''یہاں اندر ہی چائے تیار ہو رہی ہے۔ میں آپ کے لیے بھی کہہ کر آیا ہوں''، اس کے لہجے میں مٹھاس تھی۔

''آپ بھی تمام رات سوئے نہیں۔'' میں نے اس سے کوئی بات کرنے کی غرض سے پوچھا۔

''اندر جا کر میں دو گھنٹے لیٹ تو گیا تھا لیکن مجھے نیند نہیں آئی۔ دل کو فکر لاحق ہو تو نیند کہاں''، اس نے آہ بھری۔

''آپ کو کاہے کی فکر ہے، سنتری جی؟ بغیر روک ٹوک کے مزے لوٹتے ہو۔'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''سب کو، اس طرح ہی لگتا ہے۔ اندر سے ہمیں ہی پتا کہ وقت کے مارے ہوئے ہیں — نہ دن کو چین ہے، نہ رات کو آرام''، اس نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

اتنے میں چائے آ گئی۔ اپنا گلاس پکڑنے سے پہلے اس نے ایک گلاس مجھے بھجوایا۔ میں ابھی تک بینچ پر ہی بیٹھا تھا۔ وہ اپنی کرسی کھینچ کر میرے نزدیک آ گیا۔ بے خیالی میں،

میں نے دو تین گھونٹیں بھریں۔ چائے میں شکر اگرچہ زیادہ تھی مگر اس وقت یہ شکر زیادہ اچھی لگی۔ تھوڑا سا رک کر میں نے چائے کا ایک گھونٹ بھرا۔ اتنے میں سنتری نے چائے پی کر گلاس نیچے رکھ دیا۔

''آپ کسی گہری سوچ میں ہو، سنتری جی؟'' میں نے اس سے کہا۔

''کوئی خاص بات نہیں، بس باپو (والد) کی فکر ہر وقت رہتی ہے۔'' اس نے جیسے اپنے آپ سے بات کی۔

''وہ کیوں —؟ میں نے یونہی پوچھا۔

''پرانے فوجی ہیں، کئی سال پہلے صوبیدار میجر ریٹائر ہوئے تھے۔ وہ تو مجھے بھی فوج میں بھرتی کروانا چاہتے تھے لیکن میرا دل ہی نہیں مانا۔ پھر میں پولس میں بھرتی ہوگیا۔'' وہ اچانک چپ ہوگیا۔

''آپ کو اس محکمے میں اب تو بہت سال ہوگئے ہوں گے؟'' اس کی باتوں میں میری دلچسپی بڑھتی گئی۔

''ہاں، اب تو میرے بچے بھی جوان ہو رہے ہیں، لیکن وہ سب باپو کے پاس گاؤں میں ہی رہتے ہیں، ہفتہ دس دن گاؤں میں جا کر خیر، خیریت دریافت کر آتا ہوں۔'' پھر وہ خاموش ہوگیا۔

''آدمی گھر ہو آئے تو کوئی فکر نہیں رہتی''، اب میں اس بات کو ختم کرنے کی موڈ میں تھا۔

''پھر بھی، سردار جی، کوئی نہ کوئی بکھیڑا رہتا ہی ہے، ہر وقت کسی نہ کسی بات کو لے کر فکر لاحق رہتی ہے۔'' اس نے آہستہ آواز میں کہا۔

''کوئی خاص بات ہے، سنتری جی؟'' میرا اشتیاق اور بڑھا۔

''خاص ہی سمجھ لو۔ دو سال پہلے میرا سب سے چھوٹا بھائی اچھے نمبر لے کر دسویں میں پاس ہوا تو ہم نے اسے گاؤں سے دور کسی کالج میں داخل کروا دیا۔ ایک سال تو وہ خوب دل لگا کر پڑھتا رہا، پھر پتا نہیں اسے کیا ہوا، اگلی جماعت میں فیل ہوگیا''، اس نے

مزید معلومات فراہم کیں۔

''یہ تو بری بات ہوئی، پڑھائی میں اگر رکاوٹ پڑ جائے تو بڑی مشکل پیش آتی ہے۔'' میں نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔

''ہم نے کہا، چلو کوئی بات نہیں، آئندہ سال پاس ہو جائے گا لیکن وہ پہلے تو ہوسٹل سے کئی کئی دن غائب رہنے لگا پھر وہاں سے کہیں چلا گیا۔ کالج والوں نے اس کا نام کاٹ دیا''، اس نے دکھی لہجے میں بتایا۔

''اس کے بارے میں پھر کچھ پتا چلا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں — وہ جنگجوؤں کے ساتھ جا ملا۔ رات کو وہ کبھی کبھی گھر آتا، باپو اور بے بے (ماں) کو ملتا اور صبح جلدی گھر سے چلا جاتا۔ ہم اسے روکتے لیکن وہ نہ رکتا۔ میں تو زیادہ تر ڈیوٹی پر ہی رہتا تھا، مجھے تو وہ کبھی کبھار ہی ملتا تھا''، اس کے لب کپکپا رہے تھے۔

''اب کہاں ہے وہ؟'' میری آواز لرزی۔

''وہ یہیں کہیں ہے، آس پاس، کیا پتا لگتا ہے، دیوار کے پیچھے پردیس۔ ہمیں تو ہر وقت ڈر ہی لگا رہتا ہے۔ واہگورو، سچے پادشاہ، موتیوں والے، بازاں والے مہر کریں۔ مہر—''، وہ جیسے واہگورو کو حاضر ناظر جان کر ارداس کر رہا تھا۔

اتفاق سے میں بھی اس ارداس میں شامل ہو گیا۔ میرے دل میں خیال آیا کہ ہمارے آبا و اجداد سربت کا بھلا مانگتے آئے ہیں۔ پھر یہ کیوں تھا کہ کوئی مر رہا تھا کسی کی بھی طرف سے یہ سب کچھ کیوں تھا؟ روٹھوں کو کیا ہم منا نہیں سکتے؟ اپنا ہم خیال نہیں بنا سکتے؟ ایک ایک کر کے کئی سوال میرے دل میں پیدا ہوئے۔ ان سوالوں کا جواب کس کے پاس تھا؟ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ سنتری اپنی ڈیوٹی کی جگہ پر ڈٹ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ہمارے آس پاس کچھ چڑیاں چوں چوں کر رہی تھیں، ماحول بڑا پرسکون تھا، جیسے ہر چیز میں سکوت طاری ہو گیا ہو۔ سورج نکلنے والا تھا اور آسمان کے ایک طرف ربّی نور جلوہ افروز ہونا شروع ہو گیا تھا۔

15

صبح نو بجے کے قریب پروفیسر والیہ میرے پاس آ گئے۔ پتا نہیں وہ کیسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہاں تک پہنچ گئے تھے۔ وہ میری تلاش میں صبح سات بجے سے گھر سے نکلے ہوئے تھے۔ بڑی ہمت کی تھی انھوں نے—

''میں نے تو رات ہی آپ کے پاس پہنچ جانا تھا لیکن کرفیو نافذ ہونے کی وجہ سے نہ آ سکا۔''

''پھر بھی، پروفیسر والیہ، میری وجہ سے آپ کو بہت پریشانی ہوئی۔ اگر آپ کی طرف آنے کی بجائے لدھیانہ کی بس پکڑ لیتا تو ٹھیک ہی رہنا تھا۔''

''جو بات جیسے ہونی ہے ہو کر ہی رہتی ہے۔ ہم ہونی کے چکر کو بدل نہیں سکتے۔''

''پروفیسر والیہ، آپ قسمت میں یقین رکھتے معلوم ہوتے ہو، حالانکہ اسے اتفاق کہنا زیادہ مناسب ہے۔''

''بات وہی ہے جو کچھ ہونے والا ہے، اس کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے اور نہ ہی اسے روکنا ہمارے بس میں ہے۔ کیا معلوم یہ دکھ تکلیفیں ہم نے کتنی دیر اور اٹھانی ہیں۔''

''اس طرح ہے جیسے اندھیرے میں تلواریں چل رہی ہوں۔ نہ پتا دوست کون ہے، نہ پتا دشمن کون؟ جو قابو آ گیا، مارا گیا— گناہ گار ہو یا بے گناہ۔''

''پروفیسر بلبیر، آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے۔ اب بتاؤ آگے کیا کرنا ہے؟ اس محکمے میں میری کوئی براہ راست واقفیت تو نہیں، البتہ میں بھاگ دوڑ کر کے کچھ نہ کچھ ضرور کر لوں گا۔''

''تو پھر، پروفیسر والیہ، آپ یوں کرو۔ میرا ایک کلاس فیلو ہے، راجکمار اگروال۔ اس

کی ہر جگہ اچھی واقفیت ہے جب ہم ہندو کالج میں پڑھا کرتے تھے، تو لاکھ پتی خاندان میں سے تھا، اب وہ خود کروڑ پتی ہے۔ آگے آپ ہی سمجھ لو۔"

"مجھے معلوم ہے ایک مرتبہ آپ مجھے ان کے گھر لے گئے تھے تاکہ میں ان کے لڑکے کو بی کام کی انگریزی پڑھا دیا کروں۔ ان کی کوٹھی نیگور نگر میں ہی ہے نا؟"

"بالکل ٹھیک، پھر تو بات بن گئی، پروفیسر والیہ۔ اس وقت وہ اپنے گھر ہی میں ہوگا۔ اسے ساری بات بتانے کے بعد کہنا کہ پہلے ڈی سی صاحب کو، پھر پولس کپتان سے ملے۔"

"اچھا پروفیسر بلیر، میں اب چلتا ہوں اور زیادہ دیر کرنی ٹھیک نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ کوئی دفعہ لگادیں جس سے باہر نکلنا مشکل ہو جائے۔ کوئی نہ کوئی کارروائی تو انھوں نے کرنی ہی ہے۔"

یہ بات کہتے ہوئے وہ چلے گئے۔ میں پھر اپنے خیالات میں گم ہو گیا۔ بچپن میں ہم دو کہاوتیں سنا کرتے تھے اور ان پر ہنسا کرتے تھے — ایک تو تھی — 'عقل بڑی کہ بھینس'؟ اب یہ ہر لحاظ سے ثابت ہو چکی تھی کہ بھینس عقل سے کہیں بڑی تھی، دوسری کہاوت تھی — 'جس کی لاٹھی اس کی بھینس' یہ بات جتنی آج کے دور میں سچی تھی کبھی نہیں تھی۔ ضرورت لاٹھی کی تھی، بھینسوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ لاٹھی کے اس دور میں عقل کی بات کرنے والے کی خیر نہیں تھی۔ عقل کا استعمال کرنے والے کے بارے میں شاید ایک اور کہاوت تھی — 'بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی؟"

ڈیڑھ دو گھنٹے بعد راجکمار مجھے اپنی کار میں بٹھا کر لے گیا۔ پروفیسر والیہ اسکوٹر پر اپنے کالج کی طرف چلے گئے۔ راستے میں ہماری بہت ساری باتیں ہوئیں۔ میری حالت دیکھ کر ہنسی آ رہی تھی۔ اس نے بلکہ مجھے طعنہ بھی دیا کہ اگر میرے اندازے کے مطابق انقلاب آ جاتا تو میری یہ حالت نہیں ہوئی تھی۔ اس کا اشارہ 1946 میں میری کہی ہوئی اس بات کی طرف تھا جس میں میں نے دعوے کے ساتھ کہا تھا کہ سرخ انقلاب بھارت میں ایک سال کے اندر اندر آ جائے گا خیر — ملکی تقسیم کی وجہ سے ہمارے سبھی ولولے دھرے

کے دھرے رہ گئے تھے۔ میں حسب عادت کسی بھی پارٹی کے ساتھ وابستہ نہیں ہو سکا تھا، کیونکہ پارٹی کے ڈسپلن میں رہنے سے مری آزادانہ سوچ میں خلل پڑتا تھا۔ لیکن میری ہمدردی شروع ہی سے محنت کشوں کے ساتھ تھی، کیونکہ میں نے خود بھی محنت کے بل بوتے پر ہی ذاتی زندگی کی سطح کو اوپر اٹھانے کا عزم کیا تھا۔

لارنس چوک میں پہنچ کر ہماری کار اچانک رک گئی۔ راجکمار نے اتر کر دیکھا۔ اس میں کوئی معمولی نقص تھا۔ اتفاق سے وہاں سے کار مکینک کی دکان نزدیک ہی تھی۔ وہ اسے بلا لایا۔ اس وقت میں بہت تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔ رات بھر میں سو نہیں سکا تھا۔ راجکمار کا گھر وہاں سے نزدیک ہی تھا۔ رکشا لے کر میں اس کے گھر پہنچ گیا۔ مین گیٹ کھول کر اندر چلا گیا۔ میں وہاں پر کئی مرتبہ آچکا تھا۔ برآمدے میں پہنچ کر میں نے بیل کا سوئچ دبایا۔ پہلے تقریباً ایک چار سالہ بچہ آیا۔ اس نے جالی والے دروازے کی چٹخنی کھول دی۔ اتنے میں اس کی دو تین سال بڑی بہن آگئی۔ اس نے فوراً چٹخنی دوبارہ لگا دی۔ میں نے اپنے خشک ہونٹوں پر پھیکی سی مسکان پیدا کرتے ہوئے کہا—

''بے بی، میں تمھارا انکل ہوں، دروازہ کھول دو۔''

''نہیں— آپ ہمارے انکل نہیں۔'' وہ لڑکی اور پیچھے ہٹ گئی۔

''اپنی ممی کو آواز دینا''، میں نے اسے پچکارا۔

''ممی، ممی— ادھر آنا''، وہ بچی سچ مچ گھبرا گئی تھی۔

''کون ہے ڈیزی؟'' کسی کمرے میں سے یہ آواز ابھری۔

''پتا نہیں— ''، اتنا کہہ کر اپنی ممی کی طرف دوڑ گئی۔

''کس سے ملنا ہے آپ نے؟'' ایک عورت اپنی ساڑھی کا پلو ٹھیک کرتی ہوئی میرے سامنے آگئی۔

''جی، میں راجکمار کا دوست ہوں، کلاس فیلو''، آگے میں کچھ اور کہتے کہتے رک گیا۔

''وہ تو گھر نہیں ہیں، فیکٹری گئے ہوئے ہیں''، اتنی بات کہہ کر وہ گھبرا گئی۔ ''پتا نہیں وہ اس وقت کہاں ہوں؟'' کہتے تھے ہم نے باہر جانا ہے۔''

"کیا بات ہے سنیتا؟" اتنے میں راجکمار کی بیوی باہر آگئی۔

"پتا نہیں ممی — یہ سردار جی کون ہیں؟ پاپاجی کے بارے میں پوچھ رہے ہیں"، اس کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا۔

"آؤ آؤ — بھراجی (بھائی صاحب) باہر کیوں کھڑے ہو۔" اوشا نے جلدی سے جالی والا دروازہ کھول دیا اور پھر سنیتا کو کہا، "ماتھا ٹیک تمھارے شملے والے انکل ہیں۔"

"اب کاہے کے شملے والے بھابی جی"، میں اندر چلا گیا۔

"ہم تو آپ کو ابھی تک 'شملے والے' ہی کہتے ہیں۔ ہماری شادی کے بعد ہر سال آپ کے پاس شملے جانا جیسے ہماری روٹین ہی بن گئی تھی۔" اوشا نے اپنے سر کے لمبے بالوں میں کنگھی کرنی جاری رکھی۔

"سوری انکل"، سنیتا نے میرے پیروں کو چھوتے ہوئے کہا، "میں نے آپ کو پہچانا نہیں تھا۔"

"پہچانتی بھی کیسے"، میں نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "میں تمھاری اور انل کی شادی کے بعد آج یہاں پر آیا ہوں۔ زیادہ تر تو راجکمار سے فون پر ہی بات ہو جاتی تھی۔"

"آج آپ کیسے بھول کر ادھر آ گئے؟" اوشا میرے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔

"تمھارے ساتھ، آج صبح راجکمار نے کوئی بات نہیں کی؟" میں نے حیرانی کے ساتھ پوچھا۔

"نہیں — صبح انھیں کوئی ملنے آیا تھا، اس کے ساتھ ہی جلدی جلدی چلے گئے، ناشتہ کر کے بھی نہیں گئے۔" اوشا نے اپنے بالوں کو شانوں پہ کھلا چھوڑ دیا۔

"اب کروا دیجیے ناشتہ۔" راجکمار نے اندر آتے ہوئے کہا۔

راجکمار میرے سامنے سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کا بدن کافی بھاری ہو گیا تھا۔ موٹا تازہ تو وہ شروع سے ہی تھا اور میرا بدن اس وقت بھی پتلا ہوتا تھا۔ وہ میرا چار سال کلاس فیلو رہا تھا اور پچیس تیس سال، ایک طرح سے پڑوسی بھی ہماری دوستی بڑی گہری تھی۔ ہنگاموں کے

دنوں میں ہم کوٹھے پھلانگ پھلانگ کر ایک دوسرے کو مل لیتے تھے۔ بی اے کرنے کے بعد تو اپنی جدی کپڑے کی تھوک دکان پر جا بیٹھا تھا اور میں سرکاری نوکری کرنے کی غرض سے شملے چلا گیا، بعد میں اس نے گرم کپڑے بنانے کی فیکٹری لگا لی تھی۔ کئی مرتبہ تو ہم سالہا سال نہیں ملتے تھے لیکن جب ملتے تو یوں لگتا تھا جیسے روز ہی ملتے ہیں — اجنبی پن کا احساس کبھی نہیں ہوا تھا۔

''سنیتا، تو نے تو یہی سمجھا ہوگا کہ کوئی دہشت پسند آ گیا''، بریک فاسٹ کرتے وقت میں نے راجکمار کی بہو سے پوچھا۔

''نہیں، انکل''، وہ ابھی بھی پچھتاوا محسوس کر رہی تھی، میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا، بس پیچھے ہٹنے کو ہی ترجیح دی۔''

''مجھے دیکھ کر دونوں بچے سہم گئے تھے''، میں ابھی ابھی اکھڑا ہوا محسوس کر رہا تھا، کاکا نے چٹخنی کھول دی تھی لیکن بے بی نے فوراً بند کر دی۔''

''بات ایک اور بھی ہے بیری''، راجکمار تھوڑا سا ہنسا، ان بچوں نے پہلے کبھی تمہارے جیسا بندہ بھی تو نہیں دیکھا — اونچا لمبا قد، تیکھی مونچھیں، موٹے موٹے شیشوں والی عینک، بے تحاشہ لمبے پیر، کھلا ڈیل ڈول۔''

اس کی بات پر سب ہنسنے لگے۔ دونوں بچے بھی ہمارے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ کاکا کے ساتھ تو میری اچھی دوستی ہو گئی۔ اس کی شکل بالکل اٹل جیسی تھی۔ بچپن میں وہ اسی طرح کا لگتا تھا۔ بے بی اپنی ماں کی ہمشکل تھی۔ شادی کے وقت تو سنیتا بالکل ڈول جیسی تھی، خوبصورت۔ یہ باتیں اب پرانی ہو گئی تھیں۔ دلچسپ بات تو یہ تھی کہ اوشا کو بھی میں نے دلہن کی شکل میں دیکھا ہوا تھا۔ امرتسر سے شادی کے لیے لکھنؤ گئے تھے۔ ڈولی کے بعد وہاں اسٹیشن پر جب وہ ٹرین میں بیٹھی تو میں بھی کچھ دیر کے لیے راجکمار کے ساتھ اس کے پاس جا بیٹھا تھا۔ تھوڑی سی سانولی لیکن تیکھے نقش، بعد میں ہنی مون کے لیے وہ شملے آئے اور کلارکس ہوٹل میں ٹھہرے۔ شام کو ہم تینوں مال روڈ پر گھومتے تھے۔ مجھے اس طرح ان کے ساتھ گھومتے دیکھ کر میرے دوست مجھے کہنے لگے تھے: اب تم بھی شادی

کروالو پلیز۔"

"ہیری، تم اپنے بیڈروم میں جا کر تھوڑی دیر کے لیے آرام کرلو۔" راجکمار نے بریک فاسٹ کرنے کے بعد کہا۔

"تم نے کہیں جانا ہے؟" ٹیبل پر سے اٹھتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"ہاں — فیکٹری کا چکر کاٹ آؤں۔ ویسے تو انل صبح کا گیا ہوا ہے، پھر بھی میرا جانا ضروری ہے۔" راجکمار نے کار کی چابی ہاتھ میں پکڑ لی۔

"جلدی آجانا، راج"، میں بھی اس کے ساتھ برآمدے میں آگیا، "آج شام تک میں نے واپس جانا ہے۔"

"کل چلے جانا یار۔" راجکمار نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "آج شام کلب چلیں گے، رونق ہوگی۔"

"نہیں، پھر کبھی سہی — گھر والے میرا پچھلے دو دن سے انتظار کرتے ہوں گے"، یہ بات کہتا ہوا میں بیڈروم میں چلا گیا۔

بیڈ پر لیٹتے ہی مجھے کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ آہستہ آہستہ یہ آواز دور ہوتی چلی گئی۔ میری آنکھیں بند ہونی شروع ہوگئیں۔ گزشتہ رات سے میں بے آرام تھا۔ میری زبان پر تلخی تھی جیسے میں نے ابھی ابھی زہر کا گھونٹ بھرا ہو۔ پتا نہیں بہتے پانی میں کس نے زہر گھول دیا تھا؟ اپنے خاندان کے ساتھ جڑنے والی بُری نہیں تھی، لیکن وقت کی رفتار کو روکنے کی کوشش بھی قابلِ تعریف نہیں کہی جاسکتی تھی۔ بات کرنے سے اگر زبان کٹتی ہو تو وہ کٹوا لینی چاہیے۔ منہ میں زبان ہوتے ہوئے بھی خاموش رہنا، بزدلی نہیں تو اور کیا تھا؟ یہ الگ بات ہے کہ کچھ لوگ بزدلی کو عقلمندی کا نام دے دیتے ہیں اور اپنی اس چال پر اتراتے ہیں۔ بعد میں زمانہ بے شک ان کی ان کرتوتوں کو پھٹکارے یا لعنت ڈالے۔

"یاد ہے نا، راج، اس وقت سن اکاون میں تم سبھی نے اپنی مادری زبان ہندی لکھوائی تھی؟"

"پھر کیا ہوا، ہم جب پنجابی پڑھتے ہی نہیں تو کس طرح اسے مادری زبان مان

لیں؟''

''وہی غلطی بار بار، بات مادری زبان کی ہو رہی ہے، پڑھے لکھنے کی نہیں۔''

''ہماری زیادہ تر مذہبی کتابیں ہندی میں ہیں۔''

''پھر کیا ہوا، راج، آپ کی کچھ ہندی کتابیں گورمکھی رسم الخط میں بھی تو ہیں۔''

''تمھارا کیا خیال ہے، ہیری، پنجاب کا کلچر صاف وہی ہے جو دیہاتوں میں ہے؟ شہر کا اپنا کوئی کلچر نہیں؟ ہماری بول چال پر پہلے اردو زبان کا اثر رہا ہے، اب ہندی کا ہے۔''

''یہ کیا بات ہوئی، راج؟ کلچر پورے علاقے کا ایک ہوتا ہے — دیہاتوں اور شہروں کا علیحدہ علیحدہ نہیں۔ بات مجموعی کلچر کے ساتھ جڑنے کی ہے، اسے ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کی نہیں۔ بے شک ہم شہروں میں پلے بڑھے لیکن ہمارے کلچر کا سرچشمہ تو دیہاتوں میں ہی ہے۔ ہماری اصل بولی بھی وہی ہے جو وہاں بولی جاتی ہے — اس میں بے ضرورت آمیزش تو شہروں کی ہوا لگنے کی وجہ سے ہوئی۔''

''ہیری، تمھیں پتا ہے گاؤں والے ہم سبھی سے ایک جیسی نفرت کرتے ہیں؟ اس وقت وہ ہندو یا سکھ میں کوئی فرق نہیں سمجھتے۔ ان کی نظروں میں ہم آدھے پونے ہیں، کلچر کے نقطۂ نظر سے بھی اور زبان کے نقطۂ نظر سے بھی۔''

''لیکن تم یہ تو سوچو، راج کہ اس کی وجہ وہ لوگ نہیں بلکہ ہم خود ہیں۔ صدیوں سے ہم انھیں اپنی ہوشیاری کے ساتھ ذلیل و خوار کرتے آئے ہیں۔ اب پرائچت کے طور پر ہم اس بولی کو تو اپنا لیں جسے انھوں نے اپنے سینے کے ساتھ صدیوں سے لگا کر رکھا ہوا ہے۔'' ابھی بھی تمھارے جیسے کہہ رہے ہیں کہ پنجابی ہماری مادری زبان نہیں۔''

''تمھاری بات اگر مان بھی لیں، ہیری تو بھی پنجابی کو زبردستی ہمارے حلق کے نیچے نہیں اتارا جانا چاہیے۔ ہم اس کو آہستہ آہستہ قبول کرلیں گے۔''

''وقت آگے ہی بہت بیت چکا ہے، بہت نقصان ہو چکا ہے، میرے یار۔''

''ہیری، بات اب مادری زبان کے منظور یا نامنظور کرنے کی نہیں رہی۔ پنجاب کا

مسئلہ بہت الجھ چکا ہے۔"

"پھر بھی، راج اس الجھے ہوئے تانے کا سرا تو ڈھونڈنا ہی پڑے گا اور وہ سرا مادری زبان کے تئیں موہ نے ڈھونڈنا ہے۔"

"تمھارا کیا خیال ہے، بیری، اس طرح اس فاصلے کو پر کیا جا سکے گا؟"

"ہاں، اس طرح ہم اس فاصلے کو پر کرنے کے لیے اس میں پہلے پتھر پھینکیں گے۔"

"بیڈروم میں تھوڑا کھٹکا ہوا تو میری آنکھ کھل گئی۔ راجکمار اس کمرے میں تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا، "کب تک سوتا رہے گا بیری؟"

"سچ پوچھو تو میں ایک پل بھی سویا ہی نہیں، بس تمھارے ساتھ باتیں کرتا رہا — بلکہ جھگڑتا رہا۔"

"یہ تو وہی بات ہوئی، بیری کہ دن میں بھی لڑتا ہے، رات کو بھی لڑتا ہے۔"

"کمال ہے راج، تم نے تو آج خوش کر دیا۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہ بیئر پیئے گا یا کچھ اور؟"

"تمھارے گھر تو بندہ بیئر کا سپنا ہی لے سکتا ہے۔"

"نہیں، اب وہ پرانی بات نہیں، کلب میں جانے کی وجہ سے میں بھی عقلمند لوگوں کا ساتھ دینے لگا ہوں۔"

وہاں سے اٹھ کر ہم ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد نوکر بیئر کی بوتل اور دو مگ سینٹر ٹیبل پر رکھ کر چلا گیا۔ اتنے میں اوشا ایک پلیٹ میں چپز فنگرز لے کر آ گئی۔ راجکمار نے بڑے سلیقے کے ساتھ بیئر کو مگوں میں ڈالا۔ یہ سب کچھ مجھے اپنے کی طرح لگ رہا تھا، کیونکہ ان کے گھر میں کبھی پیاز تک کا استعمال نہیں ہوتا تھا۔ مگ اٹھا کر ہم نے اپنے ہونٹوں سے لگائے اور ایک ہی وقت ہم دونوں کا دایاں ہاتھ چپز فنگرز والی پلیٹ کی طرف بڑھا۔ راجکمار نے اپنے ہاتھ والا چپس اوشا کو پکڑا دیا اور ایک دوسرا اٹھا کر اپنے منھ میں ڈال لیا۔

"تمھیں لکھنؤ بہت پسند ہے، بیری؟" راجکمار نے اچانک مجھے پوچھا۔

''تمھاری شادی پر ہی وہاں گیا تھا۔ پھر تو کبھی ادھر جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔'' میں نے غیرارادی طور پر جواب دیا۔

''بات اس طرح ہے، بھرا جی۔'' یہ آواز اوشا کی تھی، ''ہم وہاں فیکٹری لگا رہے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیرانی کے ساتھ پوچھا۔

''یہ شہر اب چھوڑنا ہی پڑے گا''، راجکمار نے بیئر کا ایک اور گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

''کیوں — ؟'' میں نے اتاؤلا ہوکر پوچھا۔

''دیکھو ویری، یہاں حالات دن بدن بگڑتے جا رہے ہیں، پتا نہیں کل کیا ہوجائے، پھر نکلنا مشکل ہوجائے گا۔ پہلے انل کو وہاں بھیجوں گا، جب کام چل پڑے گا۔ یہاں کام بند کرکے ہم بھی وہاں چلے جائیں گے۔''

''مجھے یہ بتاؤ راج، کیا تم پنجابی نہیں؟ اگر ہے تو پھر یہاں سے جانے کے متعلق کیسے سوچ سکتا ہے؟'' میں شاید جذباتی ہوگیا تھا۔

''پنجابی نہیں تو اور کون ہوں؟ ہمارے آبا و اجداد مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں یہاں آکرآباد ہوگئے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے پیچھے مڑکر نہیں دیکھا — اس بات کو دو سو سال ہونے کو ہیں۔'' راجکمار کے لہجے میں نرمی آگئی۔

''تو پھر اس شہر کو جہاں تم پلے بڑھے ہو چھوڑ جائے گا؟'' میں نے اس سے تھوڑی بلند آواز میں پوچھا۔

''یہ شہر، اتنی جلدی تو نہیں چھوڑتے۔ اگر آپ لوگوں نے اسی طرح ہمارا جینا حرام کرنا نہ چھوڑا تو ہم اپنا بوریا بستر اٹھالیں گے۔'' یہ بات کہتے ہوئے راجکمار نے اپنا مگ خالی کردیا۔

''پہلے تو، راج تم یہ 'تم' اور 'ہم' والی بات بند کردو۔ یہ جو ہنگامی حالت ہے، یہ ہمارے سبھی کے لیے ہے، تمھارے یا میرے لیے الگ الگ نہیں۔''

''پیری، کہنے کو تمھاری بات ٹھیک ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ آج کا پنجاب دو پھاڑ ہو چکا ہے۔ میں یہ تمھاری بات مانتا ہوں کہ مسئلہ ہندی اور پنجابی کی بحث سے ہی شروع ہوا، پہلی مردم شماری کے موقع پر، سن اکاون میں، لیکن اب تو پلوں کے نیچے سے پانی بہت گزر چکا ہے۔ اب ان کنوئیں کو الٹا چلانا ممکن نہیں۔ یہ جو شیشے میں بال پڑ چکا ہے، یہ اب مٹ نہیں سکتا، راجکمار گہری سوچ میں ڈوب چکا تھا۔

''راج، تمھیں شاید پتا ہوگا کہ میں نے ایک جگہ پر کہا تھا کہ پنجاب کے لوگوں میں آپسی نفرت مکھن میں بال کی طرح ہے، جسے کسی بھی وقت نکالا جا سکتا ہے، نہ کہ شیشے میں آئے بال کی طرح جو کبھی بھی دور نہیں کیا جا سکتا''، مجھے اپنی یہ بات گراں ہوتی ہوئی گی۔

''ہاں بھراجی''، اوشا نے حامی بھرتے ہوئے کہا، دوردرشن پر آپ کا یہ پروگرام آیا تھا۔ میں نے دیکھا تھا، یہ اس وقت گھر پر نہیں تھے۔''

''تم نے، تو راج، یہاں سے جانے کے بارے میں سوچ لیا لیکن ہم کہاں جائیں گے۔ ہمیں تو باہر کسی نے برداشت بھی نہیں کرنا۔ ہم تو یہیں پیدا ہوئے ہیں، یہیں مریں گے۔'' میرے لہجے میں اداسی تھی۔

''پیری، یہ دھرتی، ہمیں بھی پیاری ہے لیکن کیا کریں، ہمارے ہاتھ پلے کچھ نہیں''، راجکمار نے جیسے ہار مان لی۔

''میں تو پہلے ہی بھراجی، انھیں کئی مرتبہ کہہ چکی ہوں۔'' اوشا چپ نہ رہ سکی، ''کہ میں اس شہر میں بیاہی ہوئی آئی تھی اور اسی شہر میں میری ارتھی نکلے۔''

''یونہی نہ اوٹ پٹانگ بولتے جاؤ''، راجکمار تلملایا، ''جو منھ میں آئے وہی نہیں کہتے، کچھ سوچ بھی لینا چاہیے۔''

''یہ ہنسی پتا نہیں کتنی صحیح تھی یا غلط لیکن میں بھی اس میں شامل ہو گیا اتنے میں نوکر بیئر کی ایک اور بوتل رکھ گیا۔ اوشا اٹھ کر باورچی خانہ میں چلی گئی۔ مجھے اس بات کا علم تھا کہ ان کا نوکر گھر کی سبزی تیار کر دیتا تھا لیکن روٹیاں گھر کی کوئی عورت تیار کرتی تھی۔ بی اے

کا امتحان دے کر ہم دونوں پندرہ بیس دن کے لیے ڈلہوزی چلے گئے۔ راجکمار کے ماتا جی اور ایک نوکر ہمارے ساتھ تھے۔ وہاں بھی سبزی یا دال نوکر ہی تیار کرتا لیکن روٹیاں ماتا جی آپ تیار کرتیں۔ پھولی ہوئی روٹی کھانے کی عادت مجھے انھی دنوں پڑی تھی۔ راجکمار نے دونوں مگ بیئر کے ساتھ بھر دیے۔ بیئر کی جھاگ مگ کے کناروں کے ساتھ لگ گئی۔

''ہیری، ہمارے وکیل ہیں نا گرووَر صاحب، ان کے لڑکے کو کسی گروپ نے پچھلے ہفتے اغوا کر لیا ہے۔''

''میں جانتا ہوں، گیان سنگھ گرووَر کے لڑکے نت نیم سنگھ نے ابھی گزشتہ سال ہی بی ایس سی کی تھی۔''

''تمھیں کیسے پتا ہے؟''

''راج، اس طرح کی بات چھپی نہیں رہتی۔''

''انھوں نے چٹھی میں لکھا ہے کہ ایک ہفتے کے اندر اندر پانچ لاکھ روپے دے دو، ورنہ لڑکے کی لاش ہی ملے گی — گھر والے بہت پریشان ہیں۔''

''بہت بری بات ہے۔ ان کے پاس اتنے روپے کہاں سے آئیں گے۔ تین لڑکیوں کے بعد ایک لڑکا ہے۔ وہ اسے بزنس کے سلسلے میں ایران بھیجنے کے متعلق سوچ رہے تھے۔ تمھیں پتا ہے نا کہ گرووَر صاحب اردو میں شعر کہتے ہیں، اس لیے میری بھی ان کے ساتھ قربت ہے۔''

''ہیری، ہمارا تعلق تو ان کے ساتھ وکالت تک ہی محدود ہے۔ مجھ سے دو لاکھ مانگتے تھے، میں نے کہا سارا پیسہ لگا ہوا ہے، پھر بھی کوشش کروں گا۔''

''اس طرح کے واقعات بڑے تکلیف دہ ہیں۔ پتا نہیں یہ سلسلہ کب بند ہوگا؟ مجھے اس طرح کے گھناؤنے کام کرنے والوں کے تئیں بہت نفرت ہے۔ میری تو یہ سمجھ ہے کہ کسی بھی کام کو کرنے کے لیے وسیلے ہمیشہ ٹھیک ہونے چاہئیں۔''

''ہیری، پیسہ اکٹھا کرنے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔ یہ نہیں کہ دوسرے کے

گلے میں انگوٹھا دے دو۔ صبر سے کام لینا چاہیے۔''

''راج، تم پھر کہو گے کہ میں وہی پرانی باتیں دہرانے لگا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر اس ملک کی تقسیم نہ ہوتی اور انقلاب آ جاتا۔ جیسے تقریباً سال کے بعد چین میں آ گیا تھا، تو آج ملک کے نوجوان بڑی ترقیاں کر رہے ہوتے، نئے مستقبل کا نقشہ تعمیر کر رہے ہوتے۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو، ہیری، ملک کی مالی حالت اتنی کمزور ہے کہ لوگ ہاتھ پر ہاتھ مار کر چیزیں چھیننے کے لیے مجبور ہیں۔''

''راج، یہاں ہم ایئرکنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھے بیئر پی رہے ہیں۔ باہر دھوپ بڑی سخت ہے لوگ پسینے میں شرابور ہیں، مٹی کے ساتھ لت پت ہیں، بھوکے پیاسے ہیں، ان کے سر پر چھت نہیں، پہننے کے لیے اچھے کپڑے نہیں۔ اب بتاؤ میرے دوست یہ کدھر جائیں؟ انھیں کوئی نہیں پوچھتا۔''

''پھر جذباتی ہو گیا ہے، ہیری، تمھارا یہی حال رہنا ہے۔ تم یہ بات کیوں نہیں سمجھتے کہ جس ملک کی مالی حالت اتنی کمزور ہو اس کے باشندوں کی حالت کیسے اچھی ہو سکتی ہے؟ ابھی تو اس لحاظ سے ملک میں اور بگاڑ پیدا ہو گا۔''

''پھر بھی راج میں اتنا مایوس نہیں، جتنے کہ تم نظر آ رہے ہو۔ تمھیں اپنے پیسے سنبھالنے کی فکر ہو گی، میں اس لحاظ سے بالکل بے فکر ہوں۔ اتنی بات تو میں سمجھتا ہوں کہ امیروں کا پیسہ غریبوں میں تقسیم کرنے سے حالات بہتر نہیں ہو سکتے۔ یہ شاید معاشی بدحالی کا فوری حل بھی نہیں۔ پہلا قدم تو ہر سطح پر رشوت کو روکنے کے لیے اٹھانا چاہیے۔''

''تم تو ہیری، آنے والے وقت کے متعلق بات کر رہے ہو، میں آج کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اس ماحول میں میرا تو دم گھٹ رہا ہے۔ اس طرح محسوس ہو رہا ہے جیسے میں کسی گیس چیمبر میں بند ہوں اور ہر لمحہ میری سانس کھنچی جا رہی ہو۔''

''راج، مجھے ن م راشد کی وہ نظم جس میں وہ کہتے ہیں —

تجھے موت آئے گی مر جائے گی تو
مجھے موت آئے گی مر جاؤں گا میں
یہ تری قبر وہ مری قبر

اس کے متعلق، تمہارا کیا خیال ہے؟"

17
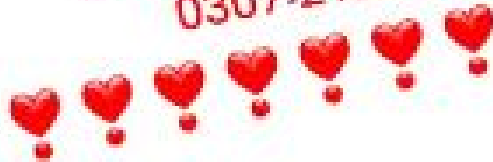
چار و ناچار میں نے شام چھ بجے لدھیانہ جانے والی ٹرین پکڑ ہی لی۔ جس ڈبے میں میں چڑھا اس میں بھیڑ بہت تھی۔ راجکمار اور اوشا مجھے اسٹیشن پر چھوڑنے کے لیے آئے۔ اپنے ڈبے کے دروازے میں کھڑے کھڑے میں نے ہاتھ ہلا کر الوداع کہی۔ کتنی ہی دیر تک وہ دونوں اپنے ہاتھ ہلاتے رہے۔ ٹرین کے ساتھ ساتھ بھی وہ تھوڑی دور تک چلے۔ جلدی ہی وہ پیچھے رہ گئے۔ ٹرین بھنڈاری برج کے نیچے سے گزرتے ہوئے آگے نکل گئی۔ پہلے سول ہسپتال پھاٹک آیا، پھر ایک اور، اس کے بعد ایک اور۔ اتنے میں ٹرین کی رفتار تیز ہوگئی۔ وہ جانی پہچانی آواز سنائی دینے لگی۔ ہوا میں فرانے بھرنے والی۔ میں انسانی رشتوں کے متعلق سوچنے لگا۔ یہ تعلقات ہمیشہ وقت اور جگہ کے ہی محتاج کیوں رہتے تھے؟ گھر، گلی بازار، شہر — ان سب کے ساتھ میرا ماضی جڑا ہوا تھا۔ میرا بچپن، لڑکپن، جوانی، ادھیڑ عمر — یہ سب اب میرے شعور کا حصہ بن چکے تھے۔ زندگی کا راستہ طویل دکھائی دیتا تھا لیکن زادِ سفر ختم ہوتا جا رہا تھا۔ میرے دل میں پیار اور نفرت کے جذبے پوری طرح گھل مل گئے تھے۔ شاید یہ ایک ہی جذبے کے دو رخ تھے۔ پیار کرتے کرتے نفرت اور نفرت کرتے کرتے پیار۔ آدمی کو اپنے آپ کے ساتھ بھی تو کبھی پیار اور کبھی نفرت ہو جاتی ہے۔ پھر جیسے ناول نگار گراہم گرین نے کہا ہے — ''میرے اندر ایک شخص ہے، جو میرے ساتھ روٹھا ہوا ہے۔''

میں نے اپنے سر کو ایک جھٹکا سا دیا۔ میں یہ کس بہاؤ میں بہتا جا رہا تھا۔ یہ وہی شہر تھا جس کو میں نے کبھی چھوڑا تھا جیسے کوئی دنیا کو چھوڑ کر جا رہا ہو۔ وہی لوگ جو میرے اپنے ہوکر اب پرائے تھے۔ باہر جا کر مجھے پرائے لوگ اپنے لگتے رہے۔ پھر ایک وقت

آیا، جب اپنے اور پرائے کا درمیانی بھید ختم ہوگیا۔ زمانے بھر کے دکھوں کو میں اپنے سینے سے لگا لیا۔ میرے دل میں ہنستے ہنستے سولی پر چڑھ جانے کی تمنا پیدا ہوئی۔ فیض احمد فیض نے پوچھا— ''یہ کس کا لہو ہے کون مرا؟ چاروں طرف سناٹا چھا گیا سب لوگ شرمسار تھے، کیونکہ سب لوگ گناہ گار تھے۔ حقیقت کے ساتھ نظریں کون ملاتا ہے؟ زخم اندر ہی اندر رستے رہے۔ یہ زخم تھے یا انگارے؟ کوئی انھیں ہاتھ لگانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کتنی ہی دیر یہ انگارے سوکھے پتوں کے تلے دہکتے رہے۔ پھر ذہن مفلوج ہوگیا، خیالات بکھر گئے۔ اپنا سایہ بھی برا لگنے لگا۔ کون ہو تم جو میرا پیچھا کر رہے ہو؟ میں تمھارا ہی بگڑا ہوا روپ ہوں، جواب ملا۔

مجھے وہ دن یاد آیا جب میرے ذہن کو کچھ سال پہلے دھکا سا لگا تھا۔ باؤجی پرانا مکان بیچ دینا چاہتے تھے کیونکہ اب نیا مکان اس کے ساتھ ہی تعمیر ہوگیا تھا۔ وہ کسی دلال کو کہہ آئے تھے، جس کی وجہ سے ایک دو آدمی مکان دیکھنے کے لیے روز آجاتے تھے۔ بات جب پھیلی تو گلی والوں نے اس میں دلچسپی دکھائی۔ ایک دن شام کو گلی کے دو آدمی باؤجی کو ملنے آئے۔ اتفاق سے اس وقت میں بھی گھر میں ہی تھا۔ سرداری نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا لیکن خیراتی نظریں چرا گیا۔

''باؤجی، پتا چلا ہے کہ ساتھ والا مکان بیچنے کے لیے رکھا ہے؟'' خیراتی نے پوچھا۔

''ہاں، ہمارے لیے اب یہی کافی ہے، اس کو سنبھال کون کرے''، باؤجی نے جواب دیا۔

''کتنے کا خیال ہے؟'' سرداری نے بات کی۔

''دلال کو اسی ہزار کہا ہوا ہے، لیکن ابھی تک ستر سے زیادہ کی آفر نہیں آئی''، باؤجی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں نے جواب دے دیا۔

''ستر بھی ٹھیک ہیں''، خیراتی نے حامی بھری، ''یہ بہت پرانا ہو چکا ہے۔''

''تمھارے مکان کے بعد ہی بنا تھا، تمھیں شاید پتا نہ ہو''، باؤجی نے خیراتی کو بتایا۔

''باؤجی، مجھے غالباً اتنا یاد ہے کہ آپ کے مکان کی اوپری منزل سن تینتیس میں بنی

تھی۔ سو پچاس سال تو اس بات کو بھی ہو گئے۔ خیراتی نے اپنے دماغ پر زور دیتے ہوئے کہا، ''لیکن نیچے کی دو منزلیں ہماری ہوش سے پہلے کی ہیں۔''

''اوپری منزل کا تو مجھے بھی پتا ہے''، سرداری نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا، اس وقت بیری اور میں 'پاندھے' پڑھنے لگے تھے۔''

''سرداری، اگلے سال ہی ہم سبزی منڈی والے اسکول میں داخل ہو گئے تھے اور 'پاندھے' کے مُنیم سے چھٹکارا حاصل کر کے شکر ادا کیا تھا۔'' میں تھوڑا مسکرایا۔

''وہ بڑی بے فکری کے دن تھے، بیری۔ اب تو جھمیلوں میں ہی پھنس گئے ہیں۔'' سرداری بھی بیتے دنوں کی یادوں میں گم ہو گیا تھا۔

''اچھا پھر، باؤجی''، ٹھیک بتاؤ، کتنی قیمت لینی ہے؟'' خیراتی بولا۔

''پچھتر ہزار لے لیں گے، اس سے کم نہیں''، باؤجی نے بات ختم کرنے کے موڈ میں کہا۔

''ڈڈی کہتا تھا کہ اگر ساٹھ ہزار پر مان گئے تو میری طرف سے ہاں کہہ دینا''، خیراتی نے مطلب کی بات کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں پچھتر ہزار سے کم نہیں''، میں نے بات کو واضح کیا۔

''اچھا پھر، آپ کی مرضی''، یہ کہتا ہوا خیراتی اٹھ کھڑا ہوا، ''لیکن ایک بات کا خیال رکھنا کہ یہ مکان کسی بیرونی آدمی کے پاس نہ جائے۔''

''بیرونی سے کیا مطلب؟'' میں نے ذرا چڑ کر پوچھا۔

''یہی کہ جیسے یہ کھتریوں کی گلی ہے، کوئی کھتری بھائی ہی آئے''، سرداری نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''کوشش تو ہماری بھی یہی رہے گی''، باؤجی نے جواب دیا، ''ہمارا تو بالکل ہی پڑوس ہے، تم تو پھر بھی چار گھر پرے رہتے ہو۔''

''جولی صاحب کے ساتھ میری بات چل رہی ہے، شاید ان کا چھوٹا بھائی بھگوان سنگھ یہ مکان خرید لے''، میں نے اپنی طرف سے کہا۔

''کون سا بھگوان سنگھ؟'' خیراتی بغیر سوچے سمجھے ہی بول اٹھا، ''ہم نے کسی شرابی کبابی کو اس گلی میں نہیں آنے دینا۔''

''خیراتی رام جی، تم اس کو جانتے نہیں، پھر تم نے کیسے شرابی کبابی کہہ دیا — تمھارا کوئی اور مطلب تو نہیں؟'' میں نے ذرا غصے میں پوچھا۔

''بلکہ —''، باؤجی نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ''اس گلی میں بھی تو کئی شرابی کبابی ہیں، چاہے چوری چھپے ہی سہی۔''

''کون ہے اس گلی میں شرابی کبابی؟'' خیراتی طیش میں آگیا اور دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

''حوصلہ رکھو، میں بتاتا ہوں''، باؤجی کی آواز خودبخود اونچی ہوگئی، ''انسان کو اپنے گریبان میں ضرور جھانک لینا چاہیے، تمھارے والد، جب وہ منگل کے ڈھابے پر زیادہ پی کر کتنی کتنی دیر بیٹھے رہتے تھے، میں کئی مرتبہ بازو سے پکڑ کر تمھارے گھر لایا کرتا تھا۔''

''یہ باتیں اب بہت پرانی ہوچکی ہیں باؤجی''، سرداری نے صلح صفائی کے موڈ میں کہا۔

''اب بھی وہی کچھ ہو رہا ہے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ''، باؤجی نے بات کو ختم کرتے ہوئے کہا۔

''پرسوں پرس رام کوٹھے پر لیٹا ہوا للکارے مار رہا تھا''، میں نے خیراتی کے پڑوس کی بات کی۔

''دیکھو خیراتی''، باؤجی ابھی بھی طیش میں تھے، ''ہمیں اس گلی میں رہتے ہوئے سو سال ہو چکے ہیں، ابھی تک کسی نے اس طرح کی بات نہیں کی تھی۔''

''باؤجی، غصہ نہ کرنا، آپ ہمارے والد کی مانند ہو''، سرداری نے بڑی حلیمی کے ساتھ کہا، ''بگڑے ہوئے حالات سے ڈر لگتا ہے۔ کوئی اجنبی بندہ اگر اس گلی میں آگیا تو ہم سبھی کو بڑی مشکل پیش آئے گی۔ ہمیں کئی باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ سکھ بھی ہمارے بھائی ہیں، بلکہ بھائیوں سے بھی زیادہ لیکن یہ جو کچھ عرصے سے ہو رہا ہے اس نے سب کو

ڈرا دیا ہے۔ کیا کریں، کدھر جائیں؟ بڑے عرصے سے بیوپار وغیرہ ٹھپ پڑا ہے۔ گاؤں کا گاہک شہر نہیں آتا، شہر والوں کی بھی کوئی گاہکی نہیں۔ سوچتا ہوں یہاں سے چلے جائیں — لیکن جائیں کہاں؟ باہر بھی ہمیں کوئی پوچھتا نہیں، جو باہر بھی گئے تھے، پھر واپس لوٹ رہے ہیں۔ آپ تو خود دانشمند ہو، باؤجی، کسی گلی والے سے بیشک مکان کی کچھ قیمت کم لے لو۔ اگر باہر کا آدمی آیا، چار آدمی اس کو ملنے آئیں گے۔ ہم سب بہنوں بیٹیوں والے ہیں، گلی کا پردہ رہنا چاہیے۔ اس دہشت پسندی سے ڈر لگتا اور کچھ نہیں۔''

خیراتی اور سرداری کے جانے کے بعد باؤجی دربار صاحب ماتھا ٹیکنے کے لیے چلے گئے۔ میں شام کی سیر کے لیے کمپنی باغ جانے کی تیاری میں مصروف ہوگیا۔ اتنے میں ست ہمارے گھر آگیا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ آتے ہی اس نے مجھ سے پانی کا گلاس مانگا۔ پانی پینے کے بعد اس نے اپنی بڑی بڑی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ پھر اس نے موٹی موٹی آنکھوں کے ساتھ میری طرف دیکھا۔

''خیراتی آیا تھا، یہاں؟''

''ہاں—''

''کیا کہتا تھا؟''

''یہی کہ مکان ہم میں سے ہی کسی کو دینا۔''

''مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ وہ اپنے بھائی ڈوڈی کے لیے کوشش کرے گا۔''

''چلو کوئی نہیں، ست، کر لے کوشش۔''

''ہمارے تو گھر کے سامنے رہتا ہے۔ ہم سے زیادہ اسے اور کون جانتا ہے۔''

''ست، تم سیدھے دفتر سے آرہے ہو؟''

''ہاں — بس پانچ منٹ پہلے جب میں گھر پہنچا تو ماتی نے بتایا کہ خیراتی اور سرداری تمھاری طرف گئے تھے۔ پرانی راہ و رسم ہونے کی وجہ سے سرداری تو یونہی اس کے ساتھ چل پڑتا ہے، ورنہ تو اس کی خود اس سے نہیں بنتی۔''

''سرداری تو اپنا یار ہے ست۔ اسکول میں جیسے میں تم سے ایک سال آگے ہوتا تھا

ویسے ہی وہ مجھ سے ایک جماعت آگے ہوتا تھا۔"

"مجھے پتا ہے بلبیر، میں یہ کہنے آیا ہوں کہ خیراتی کی کسی بات میں نہ آجانا۔"

"نہیں، نہیں — اس طرح کی کوئی بات نہیں، فکر مت کرو، بڑا ڈرپوک آدمی ہے، لیکن شیخی بہت بگھارتا ہے۔"

"دراصل خیراتی فرقہ پرست ہے اور ہر وقت الٹی سیدھی ہی سوچتا رہتا ہے۔ ہمارے ساتھ اس کی اس لیے بھی عداوت ہے کیونکہ مالتی کانگریس ورکر ہے۔"

"چلو دفع کرو، اسے، یہ بتاؤ تم کیا پیو گے؟"

"میں نے کچھ نہیں پینا، بلبیر تم اپنے دل میں کوئی ایسی بات نہ لانا۔ یہ مونچھیں میں نے پرورش کر کے ایسے ہی نہیں رکھی ہوئیں۔ صبح جب کھڑکی میں کھڑے ہو کر میں شیو کرتا ہوں تو یہ بھی اپنی کھڑکی میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس وقت میں اپنی شیو کا کام چھوڑ کر، مونچھوں کو تاؤ دینا شروع کر دیتا ہوں۔ وہ اسی وقت پیچھے ہٹ جاتا ہے۔"

"ست، تمھاری تو بس وہی باتیں رہیں۔"

"ہم نے تو ہمیشہ اس طرح ہی قائم و دائم رہنا ہے، تمھاری طرح میں نے اپنے بالوں کے لیے ڈائی بھی استعمال نہیں کرنی۔ میں نے تمام عمر لوہا دے کر چاندی خریدتے رہنا ہے — اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

"ٹرین کس پل پر سے گزر رہی تھی۔ ہاں یہ بیاس کا پل ہی تھا۔ کئی طرح کی آوازیں آپس میں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ شور اور لے بھی۔ ایک طرف ہنگامہ، دوسری طرف سکون، پھر بھی انسان کو ان ہنگاموں میں سکون کی تلاش ہے۔

"تمھارا کیا خیال ہے سردار جی، یہ شور شرابہ کب ختم ہوگا؟" میرے پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص نے پوچھا۔

"جب ہم اسے دل سے ختم کرنا چاہیں گے"، میرے منھ سے نکلا۔

"یہ بات سردار جی، اگر ہمارے ہاتھ میں ہوتی تو یہاں تک نوبت نہیں آنی تھی۔"

[illegible] ہوئے کہا۔

ڈبے میں پھر خاموشی چھا گئی۔ ٹرین کی کھڑکھڑاہٹ بدستور جاری تھی لیکن یہ اب ایک خاص لے میں بندھ چکی تھی۔ میرے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ بھیڑ ہونے کی وجہ سے میرے پاس ہی کھڑا ایک شخص بڑی دیر سے میری طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ میں بھی کنکھیوں سے اسے کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ وہ لگاتار میری طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس کی آنکھیں میرے چہرے پر چپک گئی ہوں۔ اس کی ٹکٹکی سے جھنجلا کر میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ باہر اندھیرا پھیل چکا تھا، ہوا میں خنکی تھی۔ مجھے جھن جھنی سی محسوس ہوئی۔ کھڑکی بند کرنی بھی مناسب بات نہیں تھی۔ ڈبے میں زیادہ بھیڑ ہونے کی وجہ سے میرا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ شخص ابھی بھی میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تجسس کے نشان تھے۔ وہ کافی صحت مند تھا۔ اس کے سر کے بالوں کی ایک موٹی لٹ سفید ہو چکی تھی لیکن اس کے چہرے پر ابھی بھی تازگی قائم تھی۔ اس کی عمر یہی کوئی تیں پینتیس سال سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ وہ شخص جالندھر اسٹیشن پر خالی جگہ ہونے پر میرے پاس آکر ذرا سمٹ کر بیٹھ گیا۔ میں اسے کہنے ہی والا تھا کہ اس نے خود ہی پہل کر دی۔

''جی معاف کرنا، اگر میں غلطی پر نہیں تو، آپ پروفیسر بلبیر سنگھ ہی ہیں نا؟''

''ہاں — کیوں، کیا بات ہے؟''

''جی، میں آپ کا شاگرد ہوں، آپ کو تو یاد نہیں لیکن تقریباً پندرہ سال پہلے میں سرکاری کالج ٹانڈہ اُڑمڑ میں پڑھا کرتا تھا۔''

''کیا نام ہے تمھارا؟''

''سبھاش چندر —''

''مجھے تو کچھ یاد نہیں۔''

''سر، میں اس وقت بڑا پتلا سا ہوتا تھا۔ سائیکل پر مونگاں سے آیا کرتا تھا، آپ کو میری انگریزی پر بڑی چڑ آتی تھی — پھر آپ نے ہماری دس پندرہ لڑکوں کی ویک کلاس لگانی شروع کر دی تھی۔''

''تم نے مجھے کیسے پہچان لیا؟''

''سر، آپ کی شکل تو بالکل نہیں بدلی۔ اس وقت بھی آپ ایسے ہی ہوتے تھے۔ بس آپ کا جسم تھوڑا سا بھاری ہوگیا ہے۔ پہچان تو میں نے آپ کو شروع میں ہی لیا تھا لیکن جھجک سی ہونے کی وجہ سے میں آپ سے بات نہ کرسکا۔ کتنی ہی دیر میں کشمکش میں مبتلا رہا، جب ان لالہ جی نے آپ کے ساتھ بات کی تو مجھے یقین ہوگیا کہ میں غلطی پر نہیں۔''

''آج کل کیا کر رہے ہو، سبھاش چندر؟''

''سر، میں پھلور کے سرکاری ہائر سیکنڈری اسکول میں لیکچرار لگا ہوا ہوں۔ آپ کے پاس بی اے کرنے کے بعد پھگواڑہ سے بی ایڈ کی اور پھر اسکول میں رہتے ہوئے ایم اے بھی۔''

''تم بھی سبھاش، میری ہی طرح ماسٹری میں پڑ گئے۔''

''جب، سر آپ ہمیں کالج میں پڑھایا کرتے تھے، میں نے تو اس وقت ہی فیصلہ کرلیا تھا کہ میں بھی آپ ہی کی طرح ٹیچر ہوں گا۔''

''کیوں —؟''

''اس لیے کہ آپ نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ میڈیکل پروفیشن کی طرح ٹیچنگ پروفیشن بھی نوبل پروفیشن ہے، جس میں مشنری اسپرٹ کے ساتھ کام کرنے والوں کی ضرورت ہے۔''

''ٹیچر تو سبھاش، کئی مرتبہ کلاس میں اوٹ پٹانگ باتیں کرجاتے ہیں۔ بعد میں انھیں یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ انھوں نے کیا کہا تھا۔ تم نے میری اس بات کو سنجیدگی سے لے لیا اور مشکل راستہ چن لیا۔''

''سر، میں تو آپ ہی کے نقش قدم پر چل رہا ہوں۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ یہ راستہ مشکل ہے یا آسان، بس، جس راستے پر چلنے کے لیے آپ نے اشارہ کیا تھا، میں چل پڑا۔''

''کیا پڑھاتے ہو، اسکول میں؟''

''جی میرے پاس اوپری کلاسوں کی انگلش ہے۔''

''تمھیں تو اس وقت انگریزی بہت مشکل لگتی تھی، مجھے تمھارے ساتھ کافی مغز کھپائی کرنی پڑتی تھی۔ پھر تم نے یہ مضمون کیسے چن لیا؟''

''یہ سوچ کر کہ جو سبجیکٹ میں نے بڑی مشکل سے سیکھا ہے، وہ میں دوسروں کو بھی سکھاؤں۔''

''کوئی کامیابی ملی؟''

''جی ہاں، سر — جو کچھ آپ ہمیں پڑھایا کرتے تھے میں وہی کچھ اور اسی انداز میں اپنے طلباء کو پڑھا رہا ہوں۔''

''کیا مطلب — سجاش؟''

''جی معاف کرنا — آپ کی کئی سطریں مجھے ابھی تک یاد ہیں، جو آپ کئی مرتبہ کلاس میں دہرایا کرتے تھے۔ ٹیگور کی ایک نظم کی کچھ سطریں مجھے آپ سے سن سن کر یاد ہوگئی تھیں۔''

''کون سی سطریں، سجاش؟''

''پِک دِس لٹل فلاور ڈیلے ناٹ

لیسٹ اِٹ شڈ ڈروپ اینڈ ڈراپ ان ٹو دی ڈسٹ''

''سجاش، اب تو میں یہ سب کچھ بھول چکا ہوں۔ اب تو میں اتنا دل لگا کر پڑھاتا بھی نہیں۔ اب مجھے اپنی ہی کہی ہوئی بہت ساری باتیں فضول لگتی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے میں تمھیں غلط راستے پر چلنے والی باتیں ہی بتاتا رہا، جن کا زندگی کی سچائی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں — ایک آدرش زندگی گزارنے والی باتیں۔''

''نہیں، نہیں — سر، آپ اس طرح نہ کہیے، وہ شمع جو آپ نے ہمارے دل میں روشن کی تھی، وہ ابھی تک ویسی کی ویسی روشن ہے۔''

''ٹھیک ہے سجاش — تمھاری بات صحیح ہوگی، لیکن میں بدل چکا ہوں، بہت بدل چکا ہوں۔''

''نہیں، پروفیسر صاحب — آپ نہیں بدل سکتے۔ آپ وہی ہیں ہمیں پیار کرنے والے، ہمیں صحیح راستہ دکھانے والے اور ہمارے رہنما۔''

راستہ دکھانے والے بھی تو کئی مرتبہ بھٹک جاتے ہیں سجاش۔ خاص کر اس وقت جب وہ راستہ کسی گھنے جنگل میں گم ہوجائے۔ اس گھنے جنگل میں اب صرف درندے رہتے ہیں، جو ایک دوسرے کی چیر پھاڑ کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ شکلیں ان درندوں کی خواہ کیسی ہی ہوں، لباس بھی چاہے مختلف النوع اقسام کے ہوں — لیکن اندر سے سبھی ایک جیسے ہیں، غیر مہذب۔

آہستہ آہستہ یہ جنگل جلنا شروع ہوگیا ہے۔ اس میں لپٹیں نکل رہی ہیں۔ کہتے ہیں جنگل کی آگ کبھی نہیں بجھتی، اگر بجھتی بھی ہے تو پوری تباہی مچا کر۔ کون بجھائے گا، جنگل کی اس آگ کو؟ اس آگ پر بارود چھڑک کر اسے بجھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ وہ لوگ یہ بھول گئے ہیں کہ زہر کا علاج تریاق کے ساتھ، امرت کے ساتھ ہوتا ہے نہ کہ اک کھلا کر یا انگارے چبوا کر۔ ستم گر نے ستم گری کو ہی اپنا اصول بنا لیا ہے۔ یہ وہ اصول ہے جو بدل نہیں سکتا — آشیانہ ہو یا بندی خانہ، ہر جگہ وہی اصول لاگو ہے، وہی ضابطہ ہر کسی کے لیے رائج ہے۔

''پروفیسر صاحب پھلور نزدیک آرہا ہے — آج ہمارے پاس رک جائیں۔''

''نہیں، سجاش — پھر کبھی آؤں گا۔''

''سر، پھر کب آئیں گے؟ ضرور آئیں گے نا؟''

''ہاں، ہاں — ایک دن تجھے ملنے کے لیے ضرور آؤں گا، اپنے بیتے وقت کو پہچاننے کے لیے، گزر چکی قدروں، قیمتوں کو یاد کرنے کے لیے اور زندگی کے کھوئے ہوئے معانی کو تلاش کرنے کے لیے۔''

''سر، میں پورے ولولے کے ساتھ وہی کچھ نئی نسل کو سکھا رہا ہوں، جو کچھ آپ نے ہمیں سکھایا تھا۔''

''سجاش، میں اب وہ سب باتیں بھول چکا ہوں۔ مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔ ...''

سکھایا کرتا تھا — مجھے میری ہی کوئی پرانی بات سناؤ سبھاش۔''

''سر، آپ کہا کرتے تھے کہ پیار ایک انوکھا جذبہ ہے جو بڑے سے بڑے آدمی کا دل جیت لیتا ہے۔ آپ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ ہر برے شخص میں کوئی نہ کوئی اچھائی بھی ہوتی ہے جو اسے دوبارہ ٹھیک راستے پر لا سکتی ہے۔''

''ان باتوں کی اب میرے لیے کوئی خاص اہمیت نہیں رہ گئی۔ ان باتوں کا میرے آگے کوئی ذکر نہ کرو سبھاش۔''

''لیکن میں تو ان باتوں کو اب بھول نہیں سکتا، سر، میں کیا کروں؟''

''اچھا سبھاش، تمھارا اسٹیشن نزدیک آ رہا ہے، تم اب دروازے کے قریب جا کر کھڑے ہو جاؤ۔''

''سر، آج یہیں رک جائیں، کل چلے جانا۔''

''یہ وہی پھلور ہے نا، جہاں کے پنڈت شردھارام نے عالمی شہرت یافتہ آرتی — اوم جے جگدیش ہرے — کی تصنیف کی تھی؟''

''جی ہاں، سر وہی — ہمیں کلاس میں یہ بات سب سے پہلے آپ ہی نے بتائی تھی۔''

''لیکن میں نے شاید تمھیں یہ نہیں بتایا تھا کہ پنڈت شردھارام نے 1857 میں اپنی کتاب 'پنجابی بات چیت' لکھی تھی جس سے جدید پنجابی نثر کا آغاز ہوا۔''

''ٹھیک ہے سر — آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

بلکہ اسے ہی انسانی بھائی چارے کا ذریعہ بننا چاہیے۔''

''خاموش ہو جاؤ، سبھاش — یونہی ادھوری باتیں ہی نہ بناتے جاؤ۔''

''مجھے یاد ہے، سر، پنڈت نہرو کے حوالے کے ساتھ آپ نے یہ بھی بتایا تھا کہ مذہب نے انسانوں کو اتنی راحتیں مہیا نہیں کیں جتنے دکھ پہنچائے ہیں۔ لیکن اس بات پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس میں قصور مذہب کا نہیں، بلکہ ان کا ہے

جو لوگوں کو رسموں میں الجھا کر اس کے اصلی مقصد سے دور رکھتے ہیں اور وقت پڑنے پر لوگوں کو آپس میں لڑوا دیتے ہیں۔''

''سجاش، اب تو سچ وہی ہے جو براہ راست نظر آ جائے، جیسے گوشت پوست سے نکلتی ہوئی گولی یا ٹائم بم کا دھماکہ یا حراست میں بے گناہ لوگوں کو دی جانے والی اذیتیں۔''

''آپ نے یہ بھی بتایا تھا سر، حقیقت سے منہ موڑ لینے سے حقیقت روپوش نہیں ہو جاتی۔ بلکہ وقت آنے پر آگ کی طرح اور بھی بھڑک اٹھتی ہے۔''

''میں نے یہ سب کچھ ضرور کہا ہوگا۔ میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں، میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں، میں —''

''نہیں، نہیں — سر، ایسے نہ کہیے گا، میری اتنے سالوں کی ریاضت ضائع ہو جائے گی۔ میرے دل میں رکھی ہوئی مورت میں بال پڑ جائے گا، میری کائنات پاش پاش ہو جائے گی۔ مجھے آشیرواد دیجیے میرے گلے میں نر بھر دیجیے اور اونچی بلندیوں پر پہنچنے کی پریرنا دیجیے۔''

''دیکھو سجاش — تمھارا اسٹیشن آ گیا ہے، تم یہاں پر اتر جاؤ، تمھاری یہ باتیں مجھے یاد رہیں گی۔ بہت سال پہلے میں نے جو الفاظ اپنے منہ سے نکالے تھے، تم نے انھیں عملی جامہ پہنایا ہے — انھیں صحیح معنی دیے ہیں۔ میں تمھیں پرنام کرتا ہوں، میرے بچے۔''

''سر، آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ میرے آگے اپنا سر نہ جھکائیں، یہ کام تو میرا ہے، میرا ڈنڈوت پرنام قبول کیجیے، میرے پربھو۔''

پھلور کے اسٹیشن پر ٹرین رکی اور پھر چل پڑی۔ سجاش ہاتھ جوڑ کر میرے ڈبے کے سامنے کھڑا رہا۔ وہ ٹرین کے ساتھ ساتھ نہیں دوڑا تھا اور نہ ہی اس نے الوداع کہنے کے لیے اپنا ہاتھ ہلایا تھا وہ ایک ہی جگہ پر ہاتھ جوڑ کر کھڑا رہا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے — ایک ایک کر کے لگاتار، میں نے اپنی آنکھیں زور سے موند لیں۔ میرے ذہن میں نئی سوچ اور فکر کی پھلجھڑیاں پھوٹنے لگیں۔ ٹرین اپنی تیز رفتاری کے ساتھ چلتی رہی تھی۔ جلدی ہی وہ دریا کے پل پر سے گزرنے لگی۔ ستلج کے اوپر سے گزرتی ہوئی وہ ٹرین ایک کنارہ —

سے دوسرے کنارے تک پہنچ گئی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ ہر دریا کو پل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح پل بھی دریا کی تلاش میں رہتا ہے تاکہ اس کی ہستی کو کھوئے ہوئے معانی حاصل ہوسکیں۔ بیشک، دو کناروں کے درمیان فاصلے کو پر کرنے والا پل تو پہلو رسے ہی شروع ہوگیا تھا۔

O

'کھوئے ہوئے معانی' ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ پنجابی ناول 'گواچے ارتھ' کا اردو ترجمہ ہے جس کے مصنف نرنجن سنگھ تسنیم ہیں۔ یہ ایک سوانحی ناول ہے جو 1947 اور 1984 کے فسادات اور واقعات پر مرکوز ہے۔ ناول نگار نے خوبصورت طرزِ اظہار سے اپنی زندگی کے تجربات کو تحریری شکل دے کر اسے فکشن کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ ناول میں پنجاب کی تہذیب و ثقافت کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے، ساتھ ہی ساتھ غیور پنجابیوں کی زندگی کے کھوئے ہوئے معانی کو تلاش کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔

نرنجن سنگھ تسنیم 1929 میں امرتسر میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ سے انگریزی ادب میں ایم اے کے بعد درس و تدریس کے فرائض انجام دیے اور گورنمنٹ کالج لدھیانہ سے سبکدوش ہوئے۔ وہ اپنی مادری زبان کے علاوہ انگریزی، اردو اور ہندی میں دسترس رکھتے ہیں۔ پنجابی اور اردو میں ان کے متعدد ناول منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ نیز پنجابی اور انگریزی میں ان کی کئی تنقیدی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ انھیں کئی انعامات و اعزازات سے نوازا جاچکا ہے۔

کتاب کے مترجم ڈاکٹر منظور حسن ہیں جن کی کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ ان دنوں وہ گورنمنٹ کالج، مالیر کوٹلہ، پنجاب کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں۔